الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

بے خبری کی سب سے عجیب قسم یہ ہے کہ
آدمی جس حقیقت کو اپنی ذات کے معاملہ میں جانے
اس کو وہ دوسروں کے معاملہ میں بھول جائے

مئی ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۰

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۰ — مئی ۱۹۸۹

فہرست

دو انسان	صفحہ ۲	فرضی کہانی	صفحہ ۱۲
دماغی محنت	۳	طارق بن زیاد	۱۵
حمد اور تضرع	۴	دو تصویریں	۲۳
خفیہ تصویر کشی	۷	ایک سفر	۳۱
ایک آیت	۱۰	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۴
دو کردار	۱۱	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

دو انسان

غزوۂ احد (۳ ھ) میں مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگیے۔ مسلمانوں میں بہت سے لوگ زخمی یا شہید ہوگیے۔ جنگ کے خاتمہ پر مشرکین کا سردار ایک ٹیلہ پر کھڑا ہوا اور فاتحانہ جذبہ کے تحت بلند آواز سے پکار کر کہا: لنا عزّیٰ ولا عزّیٰ لکم (ہمارے پاس عزیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر مسلمانوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم (اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں)

ان دونوں فقروں کی نفسیات پر غور کیجیے۔ مشرکین کا فقرہ فخر کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کے برعکس اہلِ ایمان کا فقرہ عبدیت کی نفسیات سے نکلا ہوا فقرہ۔ مشرک اپنے اکابر کو بُت بنا کر انھیں پوجتے ہیں۔ وہ فخر کی نفسیات میں جینے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مومن اللہ رب العالمین کو اپنا معبود بناتا ہے، وہ اس کے آگے جھک کر اس کے بڑے ہونے کا اور اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ یہ چیز مومن کو تواضع کی نفسیات میں جینے والا انسان بنا دیتی ہے۔

یہی نفسیاتی فرق وہ سب سے بڑی پہچان ہے جو اہل حق اور اہل باطل کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اہل حق عین اپنے مزاج کے تحت فخر اور ناز کے جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ انھیں تواضع میں لذت ملتی ہے۔ اپنے کو غیر نمایاں کرنا ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ ان کا بولنا آہستگی کا بولنا ہوتا ہے۔ ان کی ہر روش میں نرمی اور اعتدال کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اللہ کو سمجھتے ہیں، اور اپنے آپ کو بے کچھ کے مقام پر بٹھا کر راضی ہو جاتے ہیں۔

اہل باطل کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ فخر اور گھمنڈ کے جذبات میں جیتے ہیں۔ وہ شہرت اور سرداری کے مقام پر بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو ان کا ہر بول انانیت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ چلتے ہیں تو ان کا چلنا ناز کا چلنا ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، وہ صرف اس وقت مطمئن ہوتے ہیں جب کہ اپنے آپ کو سب سے اونچی کرسی پر بٹھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

شرک کی نفسیات سے فخر پیدا ہوتا ہے اور توحید کی نفسیات سے تواضع اور عبدیت۔

دماغی محنت

مسٹر کمال علیگ (پیدائش ۱۹۵۸) نے یکم فروری ۱۹۸۹ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بتایا۔ وہ پہلے سگریٹ پیتے تھے۔ ۱۹۸۴ سے انھوں نے مکمل طور پر سگریٹ کو چھوڑ دیا ہے۔ ۱۹۷۶ سے ۱۹۸۱ تک وہ تعلیم کے سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے۔ اس زمانہ میں وہ "چین اسموکر" تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ رات کو ایک بجے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت انھیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دیکھا تو دیا سلائی ختم ہو چکی تھی۔ ہیٹر بھی بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف اندر سے سگریٹ کی سخت طلب اٹھ رہی تھی، دوسری طرف کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جس سے سگریٹ کو جلایا جا سکے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان کے دماغ پر یہ سوال چھایا رہا۔ وہ اس سوچ میں پڑے رہے کہ سگریٹ کو کس طرح جلایا جائے۔ آخر ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی۔ ان کے کمرہ میں بجلی کا سو واٹ کا بلب لٹک رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اس جلتے ہوئے بلب میں اگر کوئی ہلکی چیز لپیٹ دی جائے تو کچھ دیر کے بعد گرم ہو کر وہ جل اٹھے گی۔ انھوں نے ایک پرانا کپڑا لیا اور اس کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر جلتے ہوئے بلب کے اوپر لپیٹ دیا۔ تقریباً ۵ منٹ گزرے ہوں گے کہ کپڑا جل اٹھا۔ کمال صاحب نے فوراً اس سے اپنا سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگے۔

اسی کا نام "دماغی محنت" ہے۔ عام لوگ محنت کے نام سے صرف جسمانی محنت کو جانتے ہیں۔ مگر محنت کی زیادہ بڑی قسم وہ ہے جس کا نام دماغی محنت ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی ترقیاں وہی ہیں جو دماغی محنت کے ذریعہ حاصل کی گئی ہیں۔ جسمانی محنت پھاوڑا چلانے یا ہتھوڑا مارنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔ مگر ایک سائنٹفک فارم یا جدید طرز کا ایک کارخانہ بنانے کا کام صرف دماغی محنت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جسمانی محنت اگر آپ کو ایک روپیہ فائدہ دے سکتی ہو تو آپ دماغی محنت کے ذریعہ ایک کروڑ روپیہ کما سکتے ہیں۔ جسمانی محنت صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ دوڑ کر بازار جائے اور ایک دیا سلائی خرید کر لائے اور اس کے ذریعہ سے اپنی سگریٹ سلگائے۔ مگر دماغی محنت ایسی حیرت انگیز طاقت ہے جو دیا سلائی کے بغیر آپ کے سگریٹ کو سلگا دے، جو ظاہری آگ کے بغیر آپ کے گھر کو روشن کر دے۔

حمد اور تضرع

عن ابی اُمامة ، قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّیْ لیجعل لی بَطحاءَ مکةَ ذَھَباً ، فقلتُ : لا یا رَبِّ، و لٰکنْ اَشبعُ یوماً و اَجُوعُ یوماً۔ فاذا جعتُ تَضَرَّعتُ الیک و ذکرتُک، واذا شبعتُ حمدتُک وشکرتُک

(رواہ احمد و الترمذی)

حضرت ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے رب نے میرے سامنے یہ پیش کش کی کہ مکہ کی وادی کو تمہارے لئے سونا بنا دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب ، نہیں۔ بلکہ مجھے یہ پسند ہے کہ میں ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب مجھے بھوک لگے تو میں تیری طرف عاجزی کروں اور تجھ کو یاد کروں۔ اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیری تعریف کروں اور تیرا شکر ادا کروں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی قدرت کا اعتراف کرکے اس کے آگے اپنے عجز کا اظہار کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرکے اس پر شکر کرنے والے بن جائیں۔ یہ دونوں باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں بتائی گئی ہیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا عملی تجربہ وہ ہے جو بھوک اور سیری کی صورت میں انسان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جب آدمی کو بھوک لگتی ہے، جب اس کو پیاس ستاتی ہے، اس وقت اس کو آخری حد تک اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کمزور اور محتاج ہے۔ اسی طرح جب بھوک پیاس کی شدت میں مبتلا ہونے کے بعد اس کو کھانا اور پانی ملتا ہے تو اس وقت اس کو آخری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ کھانا اور پانی کتنی زیادہ قیمتی چیزیں ہیں۔

اس دنیا میں آدمی کو بھوک کا تجربہ بھی ہونا چاہئے اور سیری کا بھی۔ اس پر یہ کیفیت بھی گزرنی چاہئے کہ اس کا حلق پیاس کی وجہ سے سوکھ گیا ہو، اور اسی کے ساتھ یہ کیفیت بھی کہ اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور اس کے بعد اس کا وہ حال ہو گیا جس کو حدیث میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے :

ذھب الظمأ وابتلت العروق (پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ روزہ اسی حکم کے حالات پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ روزہ کے ذریعہ آدمی کو بھوک اور پیاس دونوں کا تجربہ کرایا جاتا ہے، تاکہ وہ خدا کے آگے عاجزی کرنے والا بھی بنے اور اسی کے ساتھ اس کا شکر کرنے والا بھی۔

قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بنو .... رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا .... پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے .... اور اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی، اور تاکہ تم اس کے شکرگزار بنو (البقرہ ۸۵-۱۸۳)

ان آیات میں روزہ کے دو خاص فائدے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ روزہ آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر کرنے والا بنے۔

قرآن میں جس دینی کیفیت کے لئے تقویٰ اور شکر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اسی کو حدیث میں تضرع اور شکر کہا گیا ہے۔ یہی دونوں کیفیتیں عبدیت کی اصل ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس آدمی کے اندر تضرع اور تقویٰ کے احساسات ابھارتا ہے۔ اور اللہ کے عطیات کا احساس اس کے اندر حمد اور شکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو تو یہ دونوں کیفیتیں ہر روز ہر تجربے آدمی کے اندر پیدا ہوتی رہیں گی۔ وہ ہر واقعہ سے یہ دونوں ربانی غذائیں حاصل کرتا رہے گا۔ پھر انھیں دونوں کیفیات کو مزید شدت اور عمومیت کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے رمضان کے مہینہ کا روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ رمضان کا روزہ گویا عمومی تربیت کا خصوصی کورس ہے۔

Camera convicts traffic light jumpers

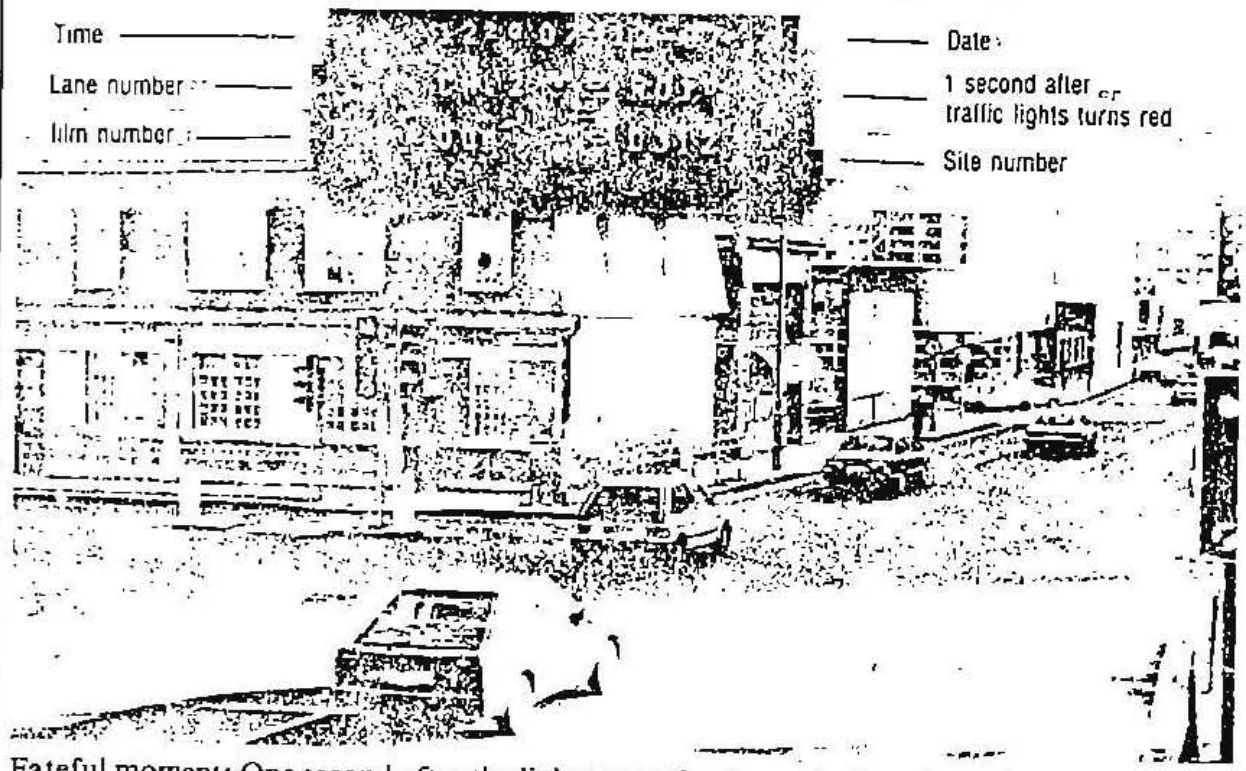

Fateful moment: One second after the lights turned red a car is filmed crossing a Nottingham junction. A second later, below, the vehicle's speed is logged.

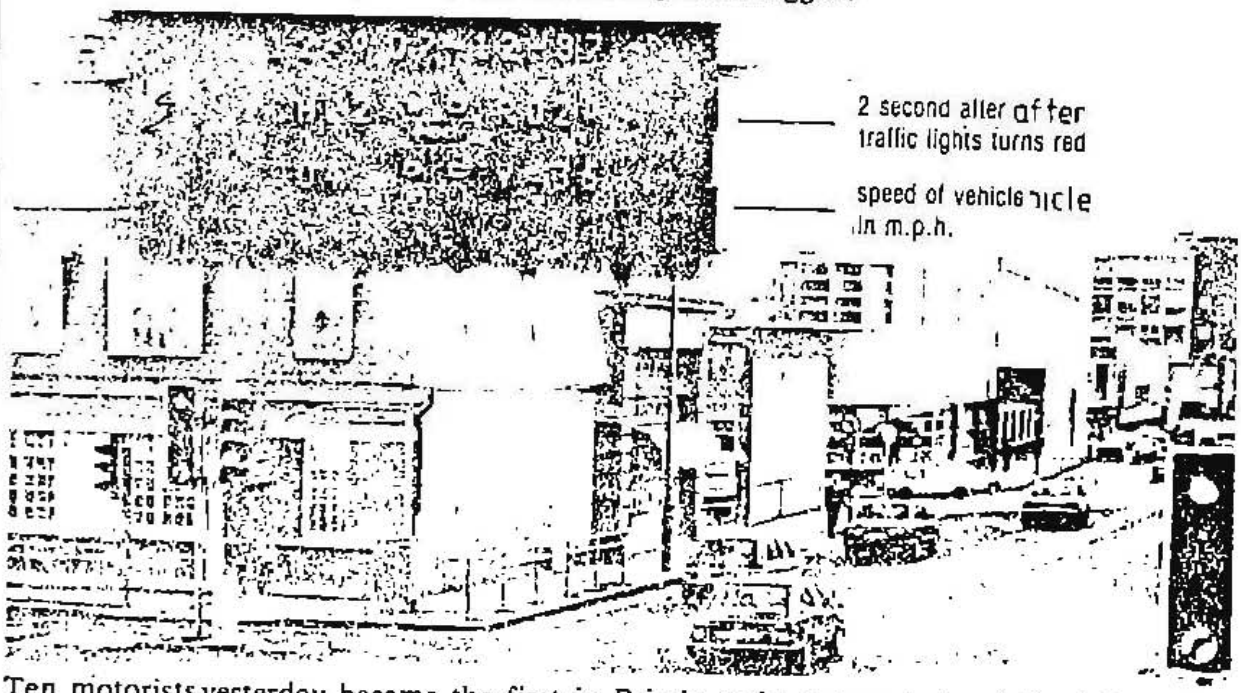

Ten motorists yesterday became the first in Britain to be prosecuted and fined for going through red traffic lights on the evidence of remote-controlled cameras which photographed them committing the offence. They fell foul of a pioneering scheme by Nottinghamshire police in which cameras were installed at two busy junctions in Nottingham.

The computer-operated cameras are activated by vehicles passing over wires under the surface of the road. They take still photographs only when the traffic lights are at red, capturing the registration number of the offending vehicle. The scheme, which is being monitored by the Home Office, is likely to be extended to 12 other busy junctions in Nottinghamshire.

The Times (London) Thursday July 28, 1988.

خفیہ تصویر کشی

مقابل کے صفحہ پر دو تصویریں درج ہیں۔ یہ انگلینڈ کی ایک سڑک سے متعلق ہیں۔ ان کا عنوان ہے: "کیمرہ ٹریفک لائٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پکڑتا ہے"۔ اوپر والی تصویر میں ایک گاڑی عین اس نازک لمحہ (Fateful moment) میں پکڑ لی گئی جب کہ وہ لال بتی والے مقام پر ٹریفک قاعدہ کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ یہ گاڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک خاص چوراہہ پر پہنچی۔ اس کے پہنچتے ہی وہاں کی لال بتی جل اٹھی۔ اب اس گاڑی کو وہاں رک جانا چاہئے تھا۔ مگر لال بتی کے باوجود وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔

ڈرائیور کو معلوم نہ تھا کہ مخفی نظام کے تحت اس کا فوٹو لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ اس نے لال بتی کو پار کیا، کیمرہ نے فوراً اس کی تصویر لے لی۔ یہ واقعہ لال بتی جلنے کے صرف ایک سکنڈ بعد پیش آیا۔

نیچے کی دوسری تصویر بھی اسی مذکورہ سڑک سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں بھی ایک گاڑی کے ڈرائیور نے یہ کیا کہ لال بتی جل جانے کے باوجود وہ رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ دوبارہ کیمرہ نے فوراً اس کی تصویر لے لی۔ یہ دوسرا واقعہ لال بتی جلنے کے دو سکنڈ بعد پیش آیا۔ پہلی تصویر میں کیمرہ نے ایک سکنڈ کی خلاف ورزی کو پکڑا، اور دوسری تصویر میں دو سکنڈ کی خلاف ورزی کو۔

یہ تصویر لندن کے اخبار ٹائمس (۲۸ جولائی ۱۹۸۸) سے لی گئی ہے۔ اس اخبار میں یہ تصویر ایک خبر کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ کار چلانے والے دس اشخاص اس جرم میں پکڑے گئے اور ان پر جرمانہ کیا گیا کہ انھوں نے سڑک کی لال بتی جل جانے کے باوجود اپنی گاڑی نہیں روکی تھی۔

ان گاڑیوں کو پکڑنے کی یہ کارروائی دور سے کنٹرول کئے جانے والے کیمروں کی شہادت پر عمل میں آئی۔ مذکورہ گاڑیاں سڑک پر تیزی سے گزرتی ہوئی دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ مگر کیمرہ میں ان کی مکمل تصویر پوری طرح محفوظ تھی۔ ان تصویروں کے ذریعہ انھیں بآسانی شناخت کر لیا گیا۔ کیوں کہ ان کیمروں نے عین جرم کے موقع پر ان کی تصویریں لے لی تھیں۔

ان کاروں کے ڈرائیور ناٹنگھم شائر پولیس کی ایک خاص اسکیم کے تحت پکڑے گئے۔ اس اسکیم کے مطابق شہر کے دو مصروف چوراہوں پر مخصوص کیمرے نصب کر دئے گئے تھے۔ یہ کیمرے کمپیوٹر سے جڑے ہوئے تھے اور ان کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔

اس اسکیم کے تحت مذکورہ چوراہہ پر سڑک کی سطح کے نیچے خاص طرح کے حساس تار رکھ دئے گئے تھے۔ کوئی گاڑی جب اس تار کے اوپر سے گزرتی تو عین اسی وقت اس سے جڑے ہوئے کیمرے متحرک ہو جاتے۔ وہ سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں فوراً مذکورہ گاڑی کا فوٹو لے لیتے۔

سڑک کے نیچے بچھے ہوئے ان تاروں کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ مذکورہ کیمروں کو عین اس وقت متحرک کر دیتے تھے جب کہ سڑک کی بتی لال ہو گئی ہو۔ اب یہ کیمرے خود کار نظام کے تحت گزرنے والی گاڑی کا فوٹو لے لیتے۔ مزید یہ کہ وہ ایسے زاویہ سے گاڑی کا فوٹو لیتے تھے کہ اس کا رجسٹریشن نمبر بھی پوری طرح فوٹو میں آجائے۔

ان کیمروں کی شہادت اتنی قطعی اور اتنی مسلّم تھی کہ ماخوذ افراد کے لئے ان کو غلط ثابت کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ سٹی مجسٹریٹ نے انھیں کی شہادت کی بنیاد پر مس الیسن مارٹن پر ۱۰۰ پونڈ کا جرمانہ کیا۔ اس خاتون نے ایک ہی دن میں دو جگہ اپنی گاڑی لال بتی پر دوڑا دی تھی۔ اسی طرح دوسرے کئی ڈرائیوروں پر مختلف جرمانے لگائے گئے۔ یہ تمام عدالتی سزائیں انھیں کمپیوٹر کیمروں کی لی ہوئی تصویروں کی بنیاد پر دی گئیں جنھوں نے دو سکنڈ اور ایک سکنڈ تک کی خلاف ورزی کو نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ کر لیا تھا۔

اس طرح کے واقعات، قرآن کے لفظوں میں، آیات اللہ (خدا کی نشانیاں) ہیں۔ وہ "نشانی" کے روپ میں حقیقت کا اظہار ہیں۔ یہ واقعات دنیوی تجربہ کے ذریعہ آخرت کے تجربہ کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ انسانی سطح پر پیش آنے والے معاملہ کی صورت میں خدائی سطح پر پیش آنے والے معاملہ کو بتا رہے ہیں۔

مذکورہ واقعہ انسان کی خفیہ ریکارڈنگ کی مثال ہے۔ یہی خفیہ ریکارڈنگ زیادہ بڑے پیمانہ پر خدا کی طرف سے ہو رہی ہے۔ انسان کی تمام گزرگاہوں پر خدا کے "تار" لگے ہیں اور اس کے ہر راستہ پر خدا کے "کیمرے" نصب ہیں۔ آدمی جیسے ہی مقررہ حد کو پار کرتا ہے، خدا کا تصویر کشی کا

نظام فوراً متحرک ہو کر اس کو محفوظ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آخرت کی عدالت میں اسی ریکارڈ کی بنیاد پر ہر آدمی کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ انسان کا بنایا ہوا نظام ہے جو ایک سکنڈ کے بقدر خلاف ورزی کو بھی فوراً پکڑ لیتا ہے پھر جب انسان کے بنائے ہوئے نظام کا یہ حال ہے تو خدا کے بنائے نظام کی گرفت کتنی زیادہ ہوگی۔ انسانی نظام محدود ہے اور خدائی نظام لامحدود۔ اسی سے دونوں نظاموں کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

آدمی اگر اس سنگین حقیقت پر غور کرے تو اس کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں۔ اس کی بولتی ہوئی زبان بند ہو جائے۔ اس کا قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے۔

دنیا میں آدمی کسی سڑک پر صرف اس وقت تک اپنی گاڑی کو غلط چلاتا ہے جب تک اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس سڑک پر ٹریفک پولیس نے اس کی غلطی کو پکڑنے کا طاقت ور انتظام کر رکھا ہے۔ پولیس کے اس انتظام کا علم ہوتے ہی ہر آدمی چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنی گاڑی کو غلط دوڑانے سے رک جاتا ہے۔

اسی طرح آدمی کو اگر اس بات کا پورا یقین ہو جائے کہ اس کے چاروں طرف خدا کی "پولیس" لگی ہوئی ہے جو ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہی ہے اور اس کی ہر چھوٹی یا بڑی کارروائی کا ریکارڈ تیار کرنے میں مشغول ہے تو اس کی ساری سرکشی ختم ہو جائے۔ یہ احساس پیدا ہوتے ہی آدمی ایک محتاط انسان بن جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے گا۔

انسان کا بگاڑ اس کا نام ہے کہ وہ اس سنگین حقیقت سے بے خبر ہو۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی اصلاح یہ ہے کہ اس کو اس سنگین حقیقت کا زندہ احساس ہو جائے۔

حقیقتِ حج از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۱۱۳ ہدیہ ۲۵ روپیہ

ایک آیت

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ، اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (الحجرات ۹)

اس آیت میں اس جنگ کا ذکر نہیں ہے جو مسلم عوام اور مسلم حکمراں کے درمیان ہو۔ ایسی جنگ اسلام میں حرام ہے۔ ایک مسلم حکومت جب وہ قائم ہو جائے، تو اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں۔ خواہ مسلم حکومت میں بگاڑ آگیا ہو، اور خواہ مسلم عوام اس کے خلاف "اصلاح سیاست" کا نعرہ لے کر کیوں نہ اٹھے ہوں۔

اس آیت کا خطاب اسلامی حکومت کے ذمہ داروں سے ہے۔ اور اس میں جس باہمی جنگ (اقتتال) کا ذکر ہے، وہ عام مسلمانوں میں سے دو گروہوں کا آپس میں لڑ جانا ہے اس آیت کا مسلم حکومت اور عوام کے درمیان جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو کسی مسلم معاشرہ میں حاکمانہ اختیار رکھتے ہوں۔ ان کے ماتحت لوگوں میں سے دو فرد یا دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اس وقت حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اس باہمی ٹکراؤ کو ختم کریں۔ حکمرانوں کو چاہئے کہ دونوں فریقوں کے درمیان باہمی رضامندی سے صلح کرادیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی فریق اپنے بھائی کے خلاف زیادتی کرے تو اس کو طاقت کے ذریعہ ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

اگر مسلم حکومت قائم ہو تو اس آیت کا خطاب مسلم حکمرانوں سے ہوگا۔ اور جہاں مسلم حکومت نہ ہو وہاں اس کے مخاطب علماء اور رہنما ہوں گے۔ اپنی استطاعت کے مطابق ان کا فرض ہوگا کہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے میں دخل دیں اور ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرکے معاملہ کو منصفانہ انداز میں ختم کرانے کی کوشش کریں۔

دو کردار

غزوۂ بدر کے بعد مدینہ کے یہودی سردار حُیی بن اخطب اور کعب بن الاشرف مکہ گئے۔ انھوں نے مکہ کے مشرکین سے ملاقاتیں کیں اور انھیں مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسایا۔

اس سلسلہ میں جو مختلف روایتیں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل مکہ نے ان سے کہا کہ تم اہل کتاب اور صاحب علم ہو۔ تم ہمارے بارے میں اور محمد کے بارے میں اپنی رائے بتاؤ۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا ہو اور محمد کیا ہیں۔ مشرکین نے کہا کہ ہم صلۂ رحمی کرتے ہیں، ہم اونٹ ذبح کرکے کھلاتے ہیں۔ ہم لوگوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ ہم مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور محمد ایک کمزور شخص ہیں جن کا کوئی وارث نہیں۔ انھوں نے ہمارے رشتوں کو کاٹا۔ حاجیوں پر ڈاکہ ڈالنے والے بنو غفار کے لوگ ان کے ساتھی ہیں۔ پھر بتاؤ کہ ہم اچھے ہیں یا وہ۔ یہودی سرداروں نے کہا کہ تم زیادہ اچھے ہو اور تمہارا طریقہ زیادہ صحیح ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۵۱۳)

اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب سے ایک حصہ ملا تھا وہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے (النساء ۵۱ — ۵۲)

اس واقعہ میں ایک کردار مشرکین کا ہے اور دوسرا کردار یہود کا۔ مشرکین نے یہ کیا کہ اپنے معاملہ کو اچھا بنا کر دکھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو بگاڑ کر پیش کیا۔ اس کے بعد یہود کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ کی دشمنی میں اس بیان کو جوں کا توں مان لیا، اور اس کی روشنی میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

یہ دونوں قسم کے کردار آج بھی موجود ہیں "مشرکین" والا کردار ادا کرنے والے بھی، اور "یہود" والا کردار ادا کرنے والے بھی۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں لعنت زدہ ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو کتنا ہی زیادہ اچھا سمجھ رہے ہوں۔

فرضی کہانی

سلمان رشدی (۴۲ سال) کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) جو ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس پر نیویارک کے ہفت روزہ ٹائم (۱۳ فروری ۱۹۸۹) میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار مسٹر پال گرے (Paul Gray) کا کہنا ہے کہ کتاب کے خلاف مسلمانوں کے عوامی احتجاجات (Public protests) غیر ضروری تھے۔ راقم الحروف خود بھی اس قسم کے احتجاج اور شور و غل کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی کتے پر نہیں بھونکتا۔ کیوں کہ ہاتھی کی عظمت بذات خود کتے کی ہر بھونک کا جواب ہے۔ اور جب چپ کی زبان کافی ہو تو بولنے کی زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

تاہم اس سلسلہ میں تبصرہ نگار نے جو توجیہہ کی ہے، اس توجیہہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ تاریخ کی جگالی (Rumination on history) ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ اصلاً تاریخی واقعات پر مبنی ہے، اور جب ایسا ہے تو اس کے خلاف ہنگامہ اور احتجاج کیوں۔ مگر یہ مفروضہ بذات خود واقعہ کے مطابق نہیں کہ کتاب میں جو باتیں درج ہیں ان کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی افسانہ ہے اور اپنی تاریخی بنیاد کے اعتبار سے بھی افسانہ۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ کتاب میں جبریل اور محمد کے درمیان تبادلۂ کلام، بظاہر بگڑے ہوئے اور خیالی انداز میں، ایک قصہ پر مبنی ہے جو محمد کی زندگی میں پیش آیا۔ پیغمبر ابتداءً اس پر راضی ہو گیے کہ عرب کی تین دیویوں کا اعتراف قرآن میں شامل کر دیں، اور بعد کو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ آیتیں شیطان کی الہام کی ہوئی تھیں۔ اگر محمد خود یہ اقرار کرنے کے لیے تیار تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس قدیم گزرے ہوئے واقعہ کا مماسی اور افسانوی بیان آج کیوں اتنے ہنگامہ کا سبب بن جائے:

> The Gibreel-Mahound exchanges are based, in an obviously distorted and hallucinatory manner, on an episode in the life of Muhammad: the Prophet's early willingness to include in the Quran an acknowledgment of three female deities and his later repudiation of these verses as satanically inspired. If Muhammad himself was willing to admit that he had been deceived, it is difficult to see why a tangential, fictional version of this long-ago event should cause such contemporary furor (p. 42).

اس اقتباس میں جس "واقعہ" کا ذکر ہے، وہ سورہ النجم سے تعلق رکھتا ہے۔ متعلقہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

افرأیتم اللات والعزیٰ۔ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ الکم الذکر ولہ الانثیٰ۔ تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ (النجم ۱۹-۲۲)

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے ایک اور منات کو۔ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہے۔

قدیم عرب میں تین بڑے بت تھے ——— لات، عزیٰ، اور منات۔ ان بتوں کو اس زمانہ میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان بتوں کی بڑائی بیان کرنے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کے کلمات وضع کر رکھے تھے۔ یاقوت الحموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: واللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ ھؤلاء الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ (قسم ہے لات اور عزیٰ کی اور تیسرے منات کی۔ یہ سب بلند مرتبہ ہیں۔ ان کی سفارش ضرور متوقع ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں سورہ النجم کی مذکورہ آیتیں اتریں تو آپ نے حسب معمول ایک مجمع میں ان کو سنایا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کچھ مشرک لوگ بھی موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے: افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تو بعض مشرکین نے اس میں اپنے الفاظ ملا دیئے۔ اپنے بتوں کے نام سن کر وہ فوراً وہ الفاظ بول پڑے جو ان بتوں کی نسبت سے پہلے سے ان کے یہاں رائج تھے اور جن کو وہ ان بتوں کے نام کے ساتھ جوڑ کر کہا کرتے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے: تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ۔

ان دوسرے الفاظ کا کوئی بھی تعلق پیغمبر اسلام سے نہ تھا۔ آپ نے تو صرف اول الذکر الفاظ (افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ) فرمائے تھے۔ ثانی الذکر الفاظ (تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ) تمام تر مشرکین کے الفاظ تھے جن کو انھوں نے آواز میں آواز ملا کر اپنی طرف سے کہہ دیا۔ یہی بات بعض مفسرین نے ان الفاظ میں کہی ہے:

ان الشیطان اوقع فی مسامع المشرکین ذلک فتوھموا انہ صدر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شیطان نے مشرکوں کے کان میں یہ الفاظ ڈال دیئے۔ پس مشرکوں نے گمان کر لیا کہ یہ خود رسول اللہ

ولیس کذلك فی نفس الامر بل انما کان من صنیع الشیطان لا عن رسول الرحمٰن صلی اللہ علیہ وسلم (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۰)

صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ وہ دراصل شیطان کا کلام تھا نہ کہ رسول رحمان کا کلام۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی نہ کسی شکل میں ہر شخص کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً حکمراں پارٹی کا لیڈر ایک بار تقریر کر رہا تھا۔ مجمع میں اس کی پارٹی کے لوگ بھی تھے اور دوسری پارٹیوں کے لوگ بھی۔ تقریر کے دوران ایک بار لیڈر نے (بطور تنقید) مخالف پارٹی کے لیڈر کا نام لیا۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے جب اپنے لیڈر کا نام سنا تو عین اسی وقت وہ "زندہ باد، زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے مخالف پارٹی کے لیڈر کے لیے زندہ باد کہا تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے تو اس کا نام محض تنقید کے لیے لیا تھا، یہ دراصل مخالف پارٹی کے لوگ تھے جو اس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر زندہ باد کے الفاظ بولنے لگے۔

واقعہ کی سادہ شکل وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی۔ مگر اسلام کے کچھ مخالفوں نے اس واقعہ کو غلط صورت دے کر ایک خود ساختہ کہانی بنائی۔ انھوں نے مشرکین کے قول کو پیغمبر کا قول قرار دیدیا۔ اور کہا کہ پیغمبر اسلام پر سورۃ النجم اتاری جا رہی تھی جب اس کا سلسلہ مناۃ الثالثۃ الاخریٰ تک پہونچا تو اس کے بعد شیطان نے مذکورہ الفاظ آپ پر القا کر دیئے۔ آپ نے قرآن کی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر مجمع میں پڑھ دیا۔ بعد کو آپ کو غلطی کا احساس ہوا تو آپ نے اعلان کیا کہ مذکورہ کلام خدا کا کلام نہیں تھا۔ وہ شیطان کا کلام تھا۔ یہ کہہ کر اس کو قرآن سے حذف کر دیا۔

یہ ساری کہانی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بالکل لغو ہے، اور اس سے بھی زیادہ لغو بات یہ ہے کہ اس کو تاریخی حیثیت دے کر اس کی روشنی میں ایک پورا افسانہ بنایا جائے اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن کو کلام خداوندی کے بجائے، نعوذ باللہ، کلام شیطانی قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کی صداقت کا بذات خود یہ کافی ثبوت ہے کہ معاندین اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے۔ ان کے پاس اپنے معاندانہ جذبہ کی تسکین کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ بطور خود ایک جھوٹی کہانی بنائیں اور اس کو قرآن کی طرف منسوب کر کے قرآن کی سچائی کو ناکام طور پر داغدار کرنے کی کوشش کریں۔

طارق بن زیاد

طارق بن زیاد نے رجب ۔ رمضان ۹۲ھ (جولائی ۷۱۱ء) میں اسپین کو فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ طارق جب آبنائے جبرالٹر کے ذریعہ سمندر کو پار کرکے اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی فوج کو اسپینیوں سے جنگ پر اکساتے ہوئے کہا:

این المفر۔ البحر من ورائکم والعدو امامکم۔ فلیس لکم واللہ الا الصدق والصبر	اب بھاگنے کی جگہ کہاں۔ سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے۔ خدا کی قسم اب تمہارے لئے صدق اور صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

حقائق کا گہرا تجزیہ بتاتا ہے کہ کشتیوں کو جلانے کا یہ قصہ محض استاں گو قسم کے لوگوں کی ایجاد ہے، وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ ایک عرب مصنف نے لکھا ہے کہ اسپین میں ایک مثل ہے کہ میں نے اپنی تمام کشتیاں جلادیں (احرقتُ کل سُفُنی) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت خرچ کردی۔ یعنی جنگ کرو یا مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ (ای بذلت کل طاقتی، بمعنی قاتلوا او موتوا) ممکن ہے کہ یہی اسپینی مثل عربی میں ترجمہ ہوئی ہو، اور پھر کچھ لوگوں نے اس کو لفظی معنی میں لے کر بطور خود کشتیوں کو جلانے کا افسانہ گھڑ لیا ہو۔

طارق بن زیاد کا قافلہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں اسپین میں داخل ہوا ہے۔ اس زمانہ کی معاصر تاریخ میں یا کسی بھی قریبی زمانہ کی تاریخی دستاویز میں کشتیوں کے جلانے کا کوئی ذکر نہیں۔ ابتدائی دور کی تمام کتابیں اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ قصہ پہلی بار ان کتابوں میں ملتا ہے جو اصل واقعہ کے ساڑھے چار سو سال بعد چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جس واقعہ کی خبر معاصر مورخین کو یا قریبی زمانہ کے تاریخ دانوں کو نہ ہوسکی، اس کی خبر سیکڑوں سال بعد کے مصنفین کو کیسے ہوگئی۔

طارق بن زیاد کے فتح اسپین (۹۲ھ) کے بارہ میں قدیم ترین ماخذ دو کتابوں کو مانا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں احراق سُفُن (کشتیاں جلانے) کا مطلق کوئی ذکر نہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

تاریخ افتتاح الاندلس، ابن القوطیہ، م ۳۶۷ھ

اخبار مجموعہ، مصنف کا نام لامعلوم، یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان کے علاوہ چوتھی صدی ہجری میں کئی مشہور مسلم مورخ گزرے ہیں۔ مثلاً ابن عبدالحکم (فتوح مصر والمغرب والاندلس)، عبدالملک بن حبیب (مبتدأ خلق الدنیا)، ابوبکر محمد القرطبی (تاریخ افتتاح الاندلس)، احمد بن محمد، ابن الفرضی (تاریخ علماء الاندلس)، القشنی (قضاۃ قرطبہ) وغیرہ۔ ان مورخین کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ طارق بن زیاد نے اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد اپنی کشتیوں کو آگ لگا دی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون تک کے یہاں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔

احراق سُفُن (کشتیوں کو جلانے) کا واقعہ پہلی بار چھٹی صدی ہجری میں بیان کیا گیا۔ ابومروان عبدالملک بن الکردبوس چھٹی صدی ہجری کا ایک مورخ ہے۔ اس نے اپنی کتاب تاریخ الاندلس میں اس قصہ کو درج کیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ قصہ اس کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا۔ اس لئے آج ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس کے ماخذ کی تحقیق کریں۔

دوسرا شخص جس نے ابتداءً اس قصہ کو بیان کیا وہ بھی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ ابوعبداللہ محمد الادریسی (م ۵۶۰ھ) ہے۔ اس نے نزہۃ المشتاق کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں احراق سفن کا قصہ درج کیا۔ مگر اس نے بھی اس کا کوئی ذریعہ نہیں بتایا۔ انھیں دونوں کتابوں سے لے کر دوسرے لوگوں نے اس قصہ کو نقل کرنا شروع کر دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو واقعہ لوگوں کو ساڑھے چار سو سال تک معلوم نہ تھا، وہ ساڑھے چار سو سال بعد کس طرح لوگوں کے علم میں آگیا۔ ایسی حالت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ سراسر فرضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دانش مند جنرل ایسا نہیں کر سکتا۔ اسپین میں قیام کے دوران طارق کا اتصال افریقہ (مغرب) سے برابر جاری رہا۔ اگر کشتیاں جلا دی جاتیں تو یہ اتصال کیوں کر ممکن ہوتا۔ طارق نے اسپین کے حالات کا اندازہ کرنے کے بعد موسیٰ بن نصیر (مقیم افریقہ) سے مدد طلب کی۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار مزید فوجی بطور امداد روانہ کئے۔ یہ پیغام رسانی اور سمندر میں لشکر کی منتقلی کشتیوں کے بغیر کیسے ممکن ہوئی۔

تاریخی تفصیلات

طارق بن زیاد رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر اترے تو ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا۔ ساحل افریقہ اور اسپین کے درمیان دس میل کی آبنائے کو، ان کے لشکر نے چار کشتیوں کے ذریعہ پار کیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک "مورخ اسلام" لکھتے ہیں:

"اس سے اس زمانہ کے جہازوں کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے۔"

موصوف نے قیاس کیا کہ پورا لشکر ایک ہی بار چار کشتیوں پر لد کر دوسری طرف پہنچ گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ اس زمانہ میں ایسی کشتی وجود میں نہیں آئی تھی جس پر دو ہزار فوجی اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ بیک وقت بیٹھ سکیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لشکریوں نے کئی پھیروں میں آبنائے طارق کو پار کیا تھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک مسلمانوں نے افریقہ کو بحر روم کے آخری ساحل تک فتح کر لیا تھا۔ بازنطینی سلطنت ایشیا اور افریقہ سے ختم ہو چکی تھی۔ تاہم مراکش کے ساحل پر سبطہ اور اس کے مضافات کے علاقے اب بھی اسپینی گورنر یلیان (کاؤنٹ جولین) کے قبضہ میں تھے۔ یہاں رومیوں نے زبردست قلعہ بنایا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اس کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی طاقت دیکھ کر بالآخر انھوں نے مصلحت یہ سمجھی کہ جولین سے صلح کر لیں اور اس ساحلی قلعہ کو اس کے قبضہ میں چھوڑ دیں۔ افریقہ سے بازنطینی سلطنت کے خاتمہ کے بعد جولین نے اپنے سیاسی تعلقات اسپین کی عیسائی حکومت سے قائم کر لئے۔ سبطہ اس وقت اندلس کا ایک سمندر پار صوبہ سمجھا جاتا تھا۔ اندلس سے برابر کشتیوں کے ذریعہ اس کو مدد پہنچتی رہتی تھی۔

یہاں یہ سوال ہے کہ جو مسلمان اسپین کے ایک ماتحت گورنر سے خود اپنے مفتوحہ براعظم میں صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے، انھوں نے سمندر پار کر کے خود اسپین پر حملہ کرنے کی جرأت کس طرح کی۔ اس کا جواب زیر بحث مسئلہ کے تاریخی مطالعہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴۱۵ء میں قوط (Visigoths) قبائل اسپین میں گھس آئے اور پانچ سو سالہ رومی سلطنت کو ختم کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ بعد کو ان لوگوں نے ٹھیک اسی طرح مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا جس طرح ترکوں کے ایک گروہ بنو سلجوق نے مسلم دنیا پر قابض ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ گاتھ

کا مقصد اس تبدیلی مذہب سے یہ تھا کہ مقامی عیسائیوں کو مطمئن کر کے اسپین میں اپنے سیاسی اقتدار کو مستحکم کریں۔ جس زمانہ میں مسلمانوں نے بازنطینی اقتدار کو شام، مصر، فلسطین سے ختم کیا، طلیطلہ (ٹالیڈو) پر گاتھ کا آخری بادشاہ وٹیکا (فیطشہ) حکمراں تھا۔ وٹیکا کی بعض کمزوریوں سے اس کے ایک فوجی افسر رذریق (Radrick) کو موقع ملا کہ وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور خود اسپین کا حکمراں بن جائے۔

سبطہ کا گورنر جولین اگرچہ وٹیکا کا رشتہ دار تھا۔ تاہم اس نے مصلحت کے تحت اپنی وفاداریاں رذریق سے وابستہ کر دیں۔ مگر بعد کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کو بے حد مشتعل کر دیا۔ اور اس کو اپنے بادشاہ کا مخالف کر کے مسلمانوں کے قریب کر دیا جو افریقی برّ اعظم میں اس کے جغرافی پڑوسی تھے۔

اس زمانہ میں اسپین کا حکمراں طبقہ بدترین قسم کی عیاشیوں کا شکار تھا۔ رواج کے مطابق امراء کی لڑکیاں عرصہ تک شاہی محل میں رکھی جاتی تھیں تاکہ شاہی آداب و قواعد کو سیکھ سکیں اور بادشاہ کی خدمت کریں۔ رذریق کے عہد میں جولین کی لڑکی فلورنڈا بھی اسی رواج کے مطابق شاہی محل میں داخل ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی تو رذریق اس پر فریفتہ ہو گیا اور جبری طور پر اس کی عصمت دری کی۔ لڑکی نے کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو دے دی۔

جولین کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک رذریق کی سلطنت کو دفن نہ کر لے، چین سے نہ بیٹھے گا۔ اولاً وہ طلیطلہ گیا اور لڑکی کی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے اس کو سبطہ واپس لایا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ بن نصیر سے ملا اور اس کو اکسا کر تسخیر اندلس پر آمادہ کیا۔ اس نے موسیٰ کو اندلس کی اندرونی کمزوریاں بتائیں اور وعدہ کیا کہ وہ اور خود اندلس کے بہت سے لوگ اس مہم میں اسلامی فوج کا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ ۹۰ھ کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جولین نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنا نام مسلم رکھا تھا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے خط و کتابت کی۔ کئی خطوط کے بعد ولید نے لکھا: "مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں نہ ڈالو۔ اگر تم پر امید ہو جب بھی ابتداءً تھوڑی سی فوج بھیج کر صحیح اندازہ کرو۔"

موسیٰ نے رمضان ۹۱ھ میں ایک شخص طریف کو، جس کی کنیت ابوزرعہ تھی پہلی مہم کے طور پر

پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین روانہ کیا۔ جولین بھی ان کے ساتھ تھا۔ شمالی افریقہ کے ساحلی ملک مراکش اور اسپین کے درمیان صرف دس میل کا آبی فاصلہ ہے۔ ان لوگوں نے چار کشتیوں کے ذریعہ اس کو عبور کیا اور دوسری طرف ساحل پر اتر گئے۔ یہ لوگ ساحلی علاقوں میں رہے اور وہاں کے حالات کا اندازہ کر کے دوبارہ واپس آ گئے۔

اس کے بعد اگلے سال رمضان ۹۲ ھ میں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سات ہزار کا لشکر تیار کیا گیا۔ دس میل کی آبنائے کو پار کر کے جب وہ لوگ اسپین کے ساحل پر اترے تو کہا جاتا ہے کہ طارق نے اپنی تمام کشتیاں جلا دیں۔ مگر کشتیاں جلانے کا واقعہ بعد کا اضافہ شدہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں، اور آج بھی، فاتح کی داستانوں میں اس قسم کے اضافے عام رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کے لئے ایک قرینہ یہ ہے کہ تاریخ اندلس کی قدیم کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے مذکور نہیں۔

بتایا گیا ہے کہ سمندر کو پار کر کے جب طارق بن زیاد اسپین کے ساحل پر اترے تو انھوں نے اپنے فوجیوں کو للکارا:

ایھاالناس! العدو امامکم والبحر وراءکم ولیس لکم واللہ الا الجلد والصبر

اے لوگو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے۔ تمہارے لئے خدا کی قسم اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ صبر کرو اور رحم کر مقابلہ کرو۔

سپہ سالار کے یہ جوشیلے الفاظ سن کر لشکر نے چیخ اٹھے:

انا ورا ءک یا طارق — طارق ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔

تمام تاریخوں کے متفقہ بیان کے مطابق مخالف فوجوں سے مقابلہ ساحل پر اترتے ہی فوراً پیش نہیں آیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تقریر بعد کو اس وقت کی گئی ہے جب کہ عملاً مقابلہ پیش آیا ہے۔ اور فتح اندلس کے بعد جب تقریر کے الفاظ "سمندر تمہارے پیچھے ہے" لوگوں میں عام ہوئے تو قصہ گویوں نے اس میں اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ تقریر کشتیوں کو جلانے کے بعد کی گئی تھی۔ شاید ان کے نزدیک سمندر کے پیچھے ہونے کے لئے ضروری تھا کہ سمندر اور فوجوں کے درمیان سے کشتیوں کو ہٹایا جا چکا ہو!

وائرلیس کے دور سے ایک ہزار سال پہلے سمندر پار کے ملک میں اترنے والا ایک کمانڈر

اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا کہ اسپین کے ساحل پر اترنے کے بعد یہی کشتیاں وہ واحد ذریعہ ہیں جن سے وہ اپنے مرکز سے مربوط رہ سکتا ہے۔ طارق اور موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے درمیان پیغام رسانی کا دوسرا کوئی ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ یہ صرف قیاس نہیں ہے بلکہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ، ساحل اسپین پر اترنے اور مقابلہ پیش آنے کے درمیان تقریباً دو ماہ تک، یہی کشتیاں تھیں جو دونوں کے درمیان باہمی ربط اور پیغام رسانی کا ذریعہ بنی رہیں۔

طارق جس مقام پر اترے اس کا نام قلۃ الاسد (Lion's rock) تھا۔ بعد کو وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوا۔ طارق اسپین کے جس ساحل پر اترے وہ اس وقت ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک دشوار گزار پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر وہ لوگ اکٹھا ہوگئے، تاکہ حالات کو سمجھ کر آئندہ کا نقشہ بنا سکیں۔ اسپین کا بادشاہ رذریق ان دنوں بنبلونہ (Pamplona) کی ایک جنگ میں مشغول تھا، جہاں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی۔ اس کو جب طارق کے اسپین میں داخلہ کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ فوج جمع کی جائے، تاکہ مداخلت کاروں کو باہر نکالا جاسکے۔ طارق کا جاسوسی نظام بھی کام کر رہا تھا۔ انھیں جب رذریق کی تیاریوں کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً اپنا ایک قاصد موسیٰ بن نصیر (گورنر افریقہ) کے یہاں روانہ کیا اور مزید کمک کی درخواست کی۔ ادھر موسیٰ بھی خاموش نہ تھے۔ بلکہ مسلسل تیاریوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ پانچ ہزار مزید سپاہی بھیج دیئے۔ اس طرح طارق کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔

طارق نے پیغام رسانی کا یہ تمام کام کشتیوں کے ذریعہ کیا۔ کوئی دوسرا ذریعہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ اور پھر یہ کشتیاں ہی تھیں جنھوں نے پانچ ہزار فوجیوں کی دوسری قسط کو اسپین کے ساحل پر اتارا، جس کے بعد طارق اس قابل ہوگئے کہ وہ اسپین پر حملہ کر سکیں۔ طارق اگر اسپین کے ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیوں کو جلا دیتے تو یہ پیغام رسانی ممکن نہ ہوتی اور نہ مقابلہ کے وقت مزید کمک پہنچ سکتی۔

اس معرکہ میں جولین بھی پوری طرح طارق کے ساتھ تھا۔ اس نے شاہ رذریق کے خلاف مقامی باشندوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تعلقات کی بنیاد پر اسپینی شہریوں کی ایک جماعت طارق کی خدمت میں حاضر کر دی۔ ان لوگوں نے دشمن کی خبریں فراہم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا اور فوجی اعتبار سے کمزور مقامات کی اطلاع مسلمانوں کو دی اور مسلمانوں کی رہبری کرتے رہے۔ یہ واقعہ بھی مسلمانوں

کے لئے ایک نعمت ثابت ہوا کہ تین سال (۹۰ - ۸۸ھ) تک اندلس میں سخت قحط پڑا تھا، اس کی وجہ سے اتنے لوگ مرے کہ کہا جاتا ہے کہ اندلس کی آبادی آدھی رہ گئی۔

مزید یہ کہ رذریق کی ایک لاکھ فوج میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جو سابق شاہ اسپین سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے باغی رذریق کا اندر اندر مخالف تھا۔ ان کے فوجی سرداروں میں شسرت اور ابتہ بھی تھے جو سابق شاہ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی خفیہ میٹنگ کی اور کہا:

"رذریق خبیث ہمارے ملک پر خواہ مخواہ مسلط ہوگیا ہے، حالاں کہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں سے ہے۔ رہے مسلمان، وہ تو صرف وقتی لوٹ مار کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے مقابلہ کے وقت اس خبیث کو زک دینے کے لئے ہم کو خود شکست کھا جانا چاہئے۔"

رذریق کی فوج کے ایک حصہ نے نہایت سخت جنگ کی۔ مگر غیر مطمئن فوجیوں نے جنگ میں زور نہیں دکھایا۔ بالآخر شکست ہوئی اور رذریق میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد وہ نہ زندہ مل سکا نہ مردہ۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگنے کے دوران وہ ایک دلدل میں پھنس کر مر گیا۔

اسپین کے بعض علاقوں کو طارق نے فتح کیا۔ بعض کو مغیث رومی نے، بعض کو موسیٰ بن نصیر نے، جو بعد کو ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہوئے تھے۔ رعایا کی اپنے بادشاہ اور سرداروں سے بیزاری کی وجہ سے ان کو خود اسپینیوں میں مددگار اور جاسوس ملتے چلے گئے۔ تمام مورخین لکھتے ہیں کہ غیر مسلم جاسوسوں نے اسپین کی ابتدائی فتوحات میں بہت مدد کی تھی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ کی دعوت پر ہوا تھا نہ کہ محض اپنی تحریک پر۔ ۷۰۹ء میں وٹیزا (Witiza) کی موت سے اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں رذریق کے مقابلہ میں وٹیزا کے خاندان نے موسیٰ بن نصیر سے مدد چاہی۔ اس کے بعد طارق ۷۱۱ء میں آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اسپین میں اترے اور رذریق کو فیصلہ کن شکست دی۔

اس کے بعد تعجب خیز طور پر اکثر اسپینیوں نے رضا کارانہ طور پر اس کی اطاعت قبول کرلی۔ ۲۰ ہزار کی ایک فوج کے ہاتھوں اس تیز رفتار فتح کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس وقت اسپین کے لوگوں میں

اتحاد نہ تھا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں سے اسپین کے لوگوں کو بہت فائدے پہنچے۔ مثلاً نئے حکمرانوں نے ان کے اوپر سے ٹیکس کا بوجھ کم کر دیا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں کو آزادی حاصل ہوگئی۔ یہود پر عیسائیوں کی طرف سے ہونے والے مظالم ختم ہوگئے اور انھیں سماج کے اندر برابری کا درجہ مل گیا۔ اس طرح آٹھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصہ میں مسلم اسپین کے اندر ایک نیا اور بالکل مختلف سماج قائم ہوگیا (17/414)

نتیجۂ بحث

تاریخ انسانی عمل کا ریکارڈ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ حقائق حیات کا مطالعہ ہے۔ لیکن تاریخ کو اگر افسانہ بنا دیا جائے تو وہ ایک ایسا ذہنی کارخانہ بن جاتی ہے جس میں صرف خوش فہمی کی جھلک گولیاں تیار ہوتی ہوں ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں طارق بن زیاد کی کامیابی ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا نتیجہ تھی نہ کہ محض پرجوش اقدام کا نتیجہ۔

خدا کی یہ دنیا کوئی طلسماتی کارخانہ نہیں ہے۔ یہ نہایت اٹل اصولوں پر قائم ہے جن کو پوری طرح سمجھا اور جانا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی واقعہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ ان قوانین کے ساتھ مطابقت کرکے عمل کیا جائے جن پر موجودہ دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

جو شخص یا قوم اپنے لئے کوئی حقیقی مستقبل دیکھنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ فطرت کی اٹل بنیادوں کو جانے اور ان کے اوپر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کی اس دنیا میں اس کا کوئی انجام نہیں، خواہ اپنے طور پر وہ اپنے بارہ میں کتنا ہی زیادہ خوش فہم ہو اور اپنی مفروضہ کامیابی کو بتانے کے لئے اس نے کتنے ہی زیادہ شاندار الفاظ پالئے ہوں۔

میوات کا سفر از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ہدیہ ۲۵ روپیہ

دو تصویریں

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر ہیں۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ اور پچھلے دس برس سے اس ملک میں وہ سیاست چلا رہے ہیں جس کا نام انھوں نے "اپوزیشن کی سیاست" رکھا ہے۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ نکالتے ہیں جس کا نام "مسلم ہندستان" مگر زیادہ صحیح لفظوں میں "ظالم ہندستان" ہے۔ اس پرچے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینہ مسلمانوں کے اوپر ظلم و تعصب کی داستانیں چھاپی جاتی ہیں۔ لیڈر صاحب کے ہر بیان اور ہر تقریر میں اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ وہ پولیس کی گولیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ انھیں زندگی کے ہر شعبہ سے دھکے دے کر نکالا جا رہا ہے۔ ان کے ملی تشخص کو مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں میں امریکہ کے سفر پر تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو مذکورہ لیڈر کے ماہنامہ (مسلم ہندستان) کے خریدار ہیں۔ اور اس کو برابر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "اس ماہنامہ کو میں اس لئے پڑھتا ہوں تاکہ ہندستانی مسلمانوں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ اس ماہنامہ کو پڑھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں۔ وہاں محرومی اور مظلومی کے سوا ان کا کوئی اور مقدر نہیں"۔ اس ماہنامہ کا خاص طریقہ یہ ہے کہ یہاں اگر ۹ پلس پوائنٹ ہوں تو وہ ان کا ذکر نہیں کرے گا، اور اگر ایک مائنس پوائنٹ مل جائے تو اس کو خوب نمایاں کر کے بیان کرے گا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر کا ایک مفصل انٹرویو دہلی کے ایک اردو ہفت روزہ (۳۱ مارچ تا ۶ اپریل ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے میں اس کے اس حصہ پر پہنچا جہاں انھوں نے انٹرویور کو اپنے گھر کے اندرونی حالات بتلائے ہیں۔ "اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں"۔ —— مسلمان لیڈر کے ان الفاظ کو پڑھ کر میں نے کچھ دیر کے لئے اخبار بند کر دیا۔ میں نے اپنے ذہن میں سوچنا شروع کیا کہ لیڈر صاحب نے اس کے بعد انٹرویور سے کیا کہا ہوگا۔ انھوں نے اپنے بچوں کے بارہ میں کس قسم کی خبریں بتائی ہونگی۔

لیڈر صاحب کے بیانات، ان کی تقریروں اور تحریروں میں جس "مسلم ہندستان" کی تصویر پیش جاتی ہے، اس کی روشنی میں میں نے سوچنا شروع کیا تو قیاسی طور پر جو بات میری سمجھ میں آئی وہ بڑی بھیانک تھی۔

میں نے سوچا کہ لیڈر صاحب نے غالباً یہ خبر دی ہوگی کہ میرا ایک لڑکا ہے۔ اس کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں مارا مارا پھرا۔ مگر اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ اس کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ آخر مجبور ہو کر وہ رکشا چلانے لگا تاکہ کسی طرح اپنا پیٹ پال سکے۔

میرا لڑکا ماشاء اللہ پنج وقتہ نمازی ہے۔ ہمارے علاقہ میں ایک ویران مسجد تھی۔ میرے لڑکے نے محلہ والوں کی مدد سے اس کو رنگ وروغن کرایا اور اس میں باقاعدہ نماز قائم کی۔ فرقہ پرست اور ملک دشمن عناصر کو یہ بات سخت ناپسند ہوئی۔ وہ ایک روز ہجوم کرکے آئے۔ انھوں نے مسجد میں گھس کر میرے لڑکے کو بری طرح مارا پیٹا۔ اس کی داڑھی نوچی جس کو وہ اپنے مذہبی تشخص کے نشان کے طور پر نہایت عزیز رکھتا ہے۔ لڑکے کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں وہ بہت دنوں تک زیر علاج رہا۔

میری ایک لڑکی کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ کوشش کے باوجود اس کو اچھے انگریزی اسکول میں داخلہ نہیں ملا۔ مجبوراً اس کو ایک معمولی قسم کے اردو میڈیم اسکول میں داخل کرنا پڑا۔ لڑکی نے پاس کورس سے بی اے کیا۔ اس کے بعد وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایم اے نہ کرسکی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کو کوئی اچھی سروس نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ اب وہ گھروں پر جاجا کر اردو اور قرآن کا ٹیوشن کرتی ہے۔ اور اس طرح زندگی کے دن گزار رہی ہے۔

یہی میرے سب بچوں کا حال ہوا۔ ملک میں اندھے تعصب کی وجہ سے کسی کی بھی اچھی تعلیم نہ ہوسکی۔ میری تمام لڑکیاں ماشاء اللہ مذہبی ہیں۔ سب کی سب خدا کے فضل سے شرعی برقعہ پہنتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی جاتی ہیں، ان کے برقعہ کو دیکھ کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی تشخص پر حملے کئے جاتے ہیں۔ کسی بھی اسکول یا کالج میں ان کو نہ داخلہ ملتا ہے اور نہ ملازمت۔

آخر کار میں نے اعلیٰ تعلیم سے مایوس ہو کر یہ طے کیا کہ لڑکیوں کی شادی کردوں۔ مگر جب

میں اپنی لڑکیوں کے لئے مسلمان شوہر کی تلاش میں نکلا تو معلوم ہوا کہ یہاں تعلیم سے بھی زیادہ بڑی مشکلات حائل ہیں۔

ہندستان کی ظالم پولیس نے مسلم نوجوانوں کو صحیح سالم حالت میں باقی نہیں رکھا تھا۔ میں نے پایا کہ کسی مسلم نوجوان کا حال یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں پولیس کی گولی لگی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا، جہاں ڈاکٹر نے اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس تھانہ میں لے گئی اور اس کے ساتھ اتنی زیادہ مار پیٹ کی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہوگیا۔ کسی مسلم نوجوان کو پولیس نے رائفل کے کندوں سے مار مار کر اس کا ہاتھ توڑ ڈالا۔ میری تلاش نے مجھے بتایا کہ قوم کے نوجوانوں کو پولیس نے یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اور جو زندہ بچے ہیں وہ بھی اس حال میں ہیں کہ ان کا جسم اور ان کے اعضاء صحیح سالم نہیں۔

مجھ کو بہرحال اپنی لڑکیوں کی شادی کرنی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر انھیں مظلوم اور معذور نوجوانوں میں سے کچھ نوجوانوں کو منتخب کیا اور ان کا نکاح اپنی لڑکیوں کے ساتھ کر دیا۔ اب میرے گھر کا حال یہ ہے کہ وہ بیک وقت معذور خانہ بھی بنا ہوا ہے اور اسی کے ساتھ غریب خانہ بھی۔ میرا گھر اس "مسلم ہندستان" کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس کا زیادہ بڑا نقشہ میں ہر مہینہ اپنے پرچہ میں دکھاتا ہوں۔

میری لڑکیاں اپنے لنگڑے لولے شوہروں کے ساتھ اس طرح رہ رہی ہیں کہ ان کی زندگیاں خوشیوں سے خالی ہو چکی ہیں۔ آسمان نے کبھی ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں اپنے بچوں اور اپنے دامادوں سے کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں، جو دنیا میں کھوئے وہ آخرت میں پاتا ہے۔ جو انسانوں کی طرف سے محروم کیا جائے اس کو خدا کی طرف سے سرفرازی عطا کی جاتی ہے۔

لیڈر صاحب کے اپنے بیانات کی روشنی میں میں نے ان کے گھر کی یہ قیاسی تصویر بنائی اور اس کے بعد دوبارہ اخبار کھولا اور لیڈر صاحب کے انٹرویو کا بقیہ حصہ پڑھنا شروع کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لیڈر صاحب کے گھر کا نقشہ اس نقشہ سے سراسر مختلف ہے جو میں نے قیاسی طور پر سمجھا تھا۔ ناقابل فہم حیرانی کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا

وہ اس "مسلم ہندستان" میں نہیں ہیں جس کی خبر وہ صبح و شام اپنے ہم قوموں کو دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک اور ملک میں ہیں جو ان کے بیانات والے ملک سے یکسر مختلف ہے۔ انٹرویو کے مطابق لیڈر صاحب کے الفاظ یہ تھے:

"اب میں ذاتی بات آپ سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ۶ بچے ہیں۔ جن میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ اور ہمارے سماج میں جس کی اتنی لڑکیاں ہوں، اس کے لئے کتنی پریشانیاں ہوتی ہیں، اس کا احساس آپ کو بھی ہوگا۔ میں نے ایک ہی بات کا وعدہ اپنی اہلیہ سے کیا کہ کچھ ہو جائے، ہم بھوکے مریں، مگر بچوں کی تعلیم پر اثر نہیں ہونے دیں گے۔ آج دس برس بعد اللہ کے فضل سے میری بڑی بیٹی کی شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر آئی اے ایس آفیسر ہے۔ دوسری بیٹی کی شادی ہوگئی اور اس کا شوہر ایم ڈی ہے۔ میرا لڑکا امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی سب سے مایۂ ناز ڈگری آپریشن ریسرچ میں پی ایچ ڈی ہے۔ اس کے بعد کی میری لڑکی اللہ کے فضل سے ڈاکٹر ہو چکی ہے، اور آج وہ دھلی میں ہاؤس سرجن ہے۔ اس کے بعد کی لڑکی آئی آئی ٹی سے دو مہینوں میں انجینئرنگ کا کورس مکمل کرلے گی۔ وہ وہاں کی ٹاپر ہے۔ آج اس کے سامنے دسیوں ملازمتوں کے آفر ہیں۔ اور میری آخری اولاد دہلی یونیورسٹی میں بی ایس سی آنرز کے دوسرے سال میں ہے۔"

یہ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ لیڈر صاحب اگرچہ اسی ملک میں رہتے ہیں، مگر ان کے گھر کا حال اس مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) سے سراسر مختلف ہے جس کی خبر وہ دنیا کو اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ پچھلے دس سال سے دے رہے ہیں۔ ان کے بیانات کے مطابق، "مسلم ہندستان" میں مسلمان صرف ایک برباد شدہ قوم بنا دئے گئے ہیں۔ مگر اسی "مسلم ہندستان" میں ان کا اپنا گھر ترقی اور خوش حالی کی اعلیٰ شاہراہ پر گامزن ہے۔

۱۹۸۹ میں مذکورہ مسلمان لیڈر کے سیاسی کیریر کے دس سال پورے ہوگئے۔ اس دس سال میں، خود ان کے اپنے بیان کے مطابق، ان کے "۶ بچوں" کا مستقبل اتنا شاندار ہو چکا ہے کہ وہ خود اس پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اسی دس سال میں ملت کے بچوں کا حال یہ ہے کہ دوبارہ، خود

ان کے اپنے بیان کے مطابق، وہ بدستور ظالمانہ تعصب کا شکار ہیں۔ ان کے سینے اب بھی پولیس کی گولیوں سے چھلنی کئے جا رہے ہیں۔ گویا شاعر کے الفاظ میں:

دو پھول ساتھ پھوٹے قسمت جدا جدا ہے　　نوشہ نے ایک پہنا اک قبر پر چڑھا ہے

اس فرق کا راز کیا ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آیا جو نومبر ۱۹۸۷ میں میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں ہندستان کے ایک شہر میں چند روز کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہاں میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر مجھ سے ملنے کے لئے میرے کمرے میں آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر آپ مسلمانوں کو جو سبق پڑھا رہے ہیں، وہ بزدلی کا سبق ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہزیمت، شکست، احساس محرومی اور مایوسی کی طرف لے جا رہا ہے۔ مجھے آپ کے اس نظریہ سے سخت اختلاف ہے۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ چلئے، آپ کو شہر کی سیر کرا دیں۔ اس کے بعد وہ مجھ کو اپنی نئی ماروتی کار پر بیٹھا کر شہر کے مختلف حصوں کو دکھاتے رہے۔ راستہ میں انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کی میونسپل کمیٹی میں نائب چیئرمین ہوں۔ میں نے کہا کہ اس شہر میں مسلمانوں کی تعداد بمشکل ۵ فی صد ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ میونسپل انتخابات میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: اپنے ذاتی معاملہ میں میری پالیسی وہی ہے جو الرسالہ کی پالیسی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں یہاں کے ہندوؤں سے ہمیشہ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ ان کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مقامی پولیس اور انتظامی افسران سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ برادرانِ وطن کو مختلف مواقع پر تحفے تحائف بھی دیتا رہتا ہوں۔ اس لئے یہاں کے سب لوگ مجھ سے خوش ہیں۔ مجھ کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کے بھی کافی ووٹ ملتے ہیں۔ کوئی بات ناخوشگواری کی ہو تو میں اس کی پروا نہیں کرتا۔

اب مذکورہ مسلمان لیڈر کی کامیابی کا راز میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے جان لیا کہ انٹرویو دینے والے لیڈر صاحب کا معاملہ بھی یقیناً یہی ہے۔ لیڈری کے اسٹیج پر تو وہ اپنی وہ پالیسی چلاتے ہیں جس کو وہ "اپوزیشن کی سیاست" یا احتجاجی سیاست کہتے ہیں۔ مگر اپنے گھر اور اپنے بچوں کے

معاملہ میں وہ عین اسی طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس کی نشان دہی الرسالہ میں تقریباً پندرہ سال سے کی جارہی ہے۔ یعنی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا اور حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے معاملات کو درست کرنا۔ باہر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں اور اندر وہ اس کو اپنا پیر و مرشد بنائے ہوئے ہیں۔

لیڈر صاحب نے اپنے انٹرویو میں اس بات کی تردید کی ہے کہ اس وقت ہندستان میں جو حالات ہیں، اس کے باقی رہتے ہوئے بھی مسلمان ترقی کی طرف گامزن ہوسکتے ہیں، ان کی موجودگی میں بھی مسلمان اپنے لئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں: مسلمان ایجی ٹیشن کی سیاست چھوڑ کر اگر صرف تجارت کریں تو یہاں کوئی انھیں تجارت کرنے نہیں دے گا۔ مسلمان اگر صرف تعلیمی جد وجہد میں مصروف ہونا چاہیں، تو انھیں تعلیمی جد وجہد کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس ملک میں جو یلغار ہے، وہ ہمارے پورے وجود پر ہے۔ اس میں اقتصادی، سماجی، سیاسی سارے حقوق اور اختیارات شامل ہیں۔ سیاسی تبدیلی لائے بغیر اور حقوق کی مانگ کئے بغیر مسلمانوں کو اس ملک میں کچھ نہیں ملے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ نئی "مسلم ہندستان" جس میں عام مسلمانوں کے لئے، لیڈر صاحب کے بیان کے مطابق، ترقی کے مواقع بالکل ختم ہوچکے ہیں۔ یہاں موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ مگر اسی مسلم ہندستان میں خود ان کا اپنا خاندان جو بچوں اور ان کے متعلقین کو ملاکر ایک درجن سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے، وہ کیسے کامیاب ہوگیا۔ کس طرح اس نے اسی ظالم ہندستان میں اپنے لئے قابل رشک حد تک ایک شاندار مستقبل تعمیر کرلیا۔

مذکورہ مسلمان لیڈر نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ انھوں نے طے کیا کہ "ہم بھوکے رہیں گے مگر ہم اپنے بچوں کو پڑھائیں گے"۔ لیڈر صاحب نے اس پر باقاعدہ عمل کیا۔ ان کا کامیاب تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ "مسلم ہندستان" کا ایک باشندہ "بھوکا" رہ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاسکے۔ حتی کہ صرف دس برس میں ان کا شاندار مستقبل بن کر کھڑا ہوجائے۔ دس سالہ محنت کے بعد اس کا اپنا پیٹ بھی بھر جائے اور اس کے تمام بچوں کا بھی۔

لیڈر صاحب کے مذکورہ جملہ (ہم بھوکے رہیں گے مگر اپنے بچوں کو پڑھائیں گے) پر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس ایک جملے کے اندر معانی کا پورا خزانہ ہے۔ اس کے اندر زندگی کی تعمیر کا

زبردست راز چھپا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو الرسالہ کے ذریعہ مسلسل طور پر مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ زندگی کی تعمیر کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کو راقم الحروف نے اپنے آرٹیکل مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ:

Starve the problems, feed the opportunities.

لیڈر صاحب نے، الرسالہ کے اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے، اپنے بچوں کو سکھایا کہ مسائل کو بھلاؤ اور مواقع کو استعمال کرو۔ حقوق طلبی کا جھنڈا مت اٹھاؤ بلکہ محنت کے ذریعہ اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرو۔ شکایت اور احتجاج کو چھوڑ دو اور مثبت ذہن کے تحت کام کرو۔ حالات سے لڑنے کی حماقت نہ کرو بلکہ حالات سے مطابقت کرکے اپنے مستقبل کی تعمیر کرو۔ ملک کے اندر غیر موافق پہلو بھی ہیں اور موافق پہلو بھی۔ تم لوگ غیر موافق پہلو کو نظر انداز کرو اور جو موافق پہلو ہیں ان پر اپنی ساری توجہ لگا دو۔ تم ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کرو۔

ایک لفظ میں یہ کہ میں گھر کے باہر لیڈری کے اسٹیج پر الرسالہ کے اصول کی مخالفت کروں گا، اور تم لوگ گھر کے اندر الرسالہ کے اصول کو دانتوں سے پکڑ لو۔ کیوں کہ یہاں کے حالات میں لیڈرانہ مقام الرسالہ والے طریقہ کی مخالفت کرنے میں ملے گا، اور حقیقی کامیابی اس کے طریقہ کو اختیار کرنے میں۔ یہی دو طرفہ تکنیک ہے جس نے بیک وقت دونوں کو کامیاب و بامراد کر دیا ہے، لیڈر کو بھی اور لیڈر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی۔

مسلمان لیڈر نے غالباً اسی مصلحت کی خاطر مزید اہتمام یہ کیا کہ اپنے تمام بچوں کو انگلش اسکولوں میں داخل کرکے پڑھایا۔ انھوں نے اپنے کسی بچہ کو اردو میڈیم اسکول میں تعلیم نہیں دلائی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے مفروضہ مسلم ہندستان (یا ظالم ہندستان) کو جاننے کا سب سے بڑا ذریعہ مسلمانوں کے وہ "زرد اخبارات" ہیں جو اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ بچوں نے اگر اردو جان لی تو وہ اردو کے زرد اخبارات پڑھیں گے، اور پھر ان کا ذہن غیر ضروری طور پر شکایت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ دوسرے مسلمان بچوں کی طرح سڑکوں پر مظاہرے کریں گے اور خواہ مخواہ پولیس کی گولیاں کھائیں گے۔ اس لئے عقل مندی یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اردو زبان سے

ناواقف رکھا جائے تاکہ وہ نہ اردو زبان کے زرد اخبارات پڑھیں اور نہ اس مفروضہ ہندستان کو جان سکیں جہاں مسلمانوں کے لئے احتجاج اور ایجی ٹیشن کے سوا کچھ اور کرنے کا موقع ہی نہیں۔ جب بانس ہی نہ ہوگا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔

یہاں میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہ صرف ایک مسلم لیڈر کی بات نہیں، یہی تقریباً تمام مسلم لیڈروں اور رہنماؤں کی بات ہے، خواہ وہ بے ریش رہنما ہوں یا باریش رہنما۔ ان میں سے ہر ایک کا معاملہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں مذکورہ لیڈر کا نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دوسروں کے سامنے الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں، مگر خود وہ دل وجان سے الرسالہ کو اپنا پیر ومرشد بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ظاہری طور پر الرسالہ کے طریقہ کو غلط بتاتے ہیں۔ مگر اندرونی طور پر وہ اپنے بچوں کو اور اپنی زندگی کے تمام ذاتی معاملات کو الرسالہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلا رہے ہیں۔

یہی وہ دوطرفہ کردار ہے جس کو فارسی شاعر نے تمثیلی طور پر ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ وہ بظاہر مے کا انکار کرتے ہیں، مگر عملاً وہ خود بھی مے پرستوں ہی کے رنگ میں جیتے ہیں:

منکرے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

یہ تقسیم کیسی المناک ہے کہ مسلمانوں کے نام نہاد لیڈروں نے اپنے لئے زندگی کا انتخاب کیا ہے، اور عوام کے لئے موت کا۔ ایک لفظ میں یہ کہ ـــــ جنھیں مرنا نہیں وہ للکارتے ہیں، اور جو للکارتے نہیں وہ مارے جاتے ہیں۔

کتنے ہوشیار ہیں مسلمانوں کے لیڈر، اور کتنے نادان ہیں ان کے مسلمان پیرو جو کھلے ہوئے استحصال کو دیکھتے ہیں، پھر بھی پوری وفاداری کے ساتھ ان کے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ اتنا عجیب منظر شاید اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

دینِ کامل از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۶۸ ہدیہ ۴۰ روپیہ

ایک سفر

ایک تعلیمی سمینار کی دعوت پر بھوپال کا سفر ہوا۔ ۷ نومبر کو انڈین ایر لائنز کا ٹکٹ منگایا گیا جس کا نمبر 0582-3899903 تھا۔ اس ٹکٹ کے ساتھ ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ اس پر بلوری ادا شدہ قیمت (۱۲۰۰ روپیہ) لکھی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ اس پر دہلی۔ بھوپال۔ دہلی درج تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھوپال کا ریٹرن ٹکٹ ہے۔ مگر کھول کر دیکھا تو اس میں قاعدہ کے مطابق دو سلپ موجود نہ تھی۔ اس میں صرف ایک سلپ تھی اور اس سلپ پر فلائٹ کوپن نمبر ۲ (Flight coupon no. 2) لکھا ہوا تھا۔ کلرک نے فلائٹ کوپن نمبر ۱ کو پھاڑ کر نکال لیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ٹکٹ بھوپال سے دہلی کی واپسی میں کار آمد ہے، مگر دہلی سے بھوپال جانے کے لئے کار آمد نہیں۔

سرکاری دفتروں میں عام طور پر کارکردگی کا یہی حال ہے۔ ہندستان کے کسی سرکاری دفتر میں جب بھی کوئی کام کرایا جائے تو اس کو اسی وقت پوری طرح چیک کر لینا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ کچھ معلوم نہیں کہ انھوں نے آپ کے کام میں کون سی قابل قیاس یا ناقابل قیاس غلطی کر دی ہو۔

میرا واپسی کا ریزرویشن کنفرم نہ تھا۔ ایر پورٹ پہنچ کر میں نے سوچا کہ یہاں اس کو کنفرم کرالوں۔ متعلقہ کھڑکی (Endorsement & Reservation) پر پہنچا تو وہاں لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ بعد کو آرہے ہیں وہ پیچھے کھڑے ہونے کے بجائے کھڑکی میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں، ویسے ہی جیسے بسوں اور ریلوں کا ٹکٹ لینے میں عام طور پر ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے لوگ عام طور پر پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کیوں جاہلوں کا سا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان میں تعلیم کی شرح بمشکل ۲۰ فی صد ہے۔ اور جس سماج کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہو، وہاں کی تعلیم یافتہ اقلیت بھی اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے جو سماج کی عام حالت ہو۔ کسی سماج کی شعوری اور تہذیبی حالت کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام افراد کو تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ جز کی ذہنی حالت کو بلند کرنے کے لئے کل کی ذہنی حالت کو بلند کرنا پڑے گا۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۸ کو انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۳۳ کے ذریعہ بھوپال کے لئے روانگی ہوئی۔ دہلی سے جہاز ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا۔ زمین پر دیر تک کھڑا رہنے کے بعد جب جہاز رن وے پر دوڑا اور پھر "ٹیک آف" کر کے فضا میں اڑنے لگا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے میری زندگی کا "جہاز" اب تک زمین پر لینڈ کئے ہوئے تھا اور اب وہ زمین سے اوپر اٹھ کر آخرت کی طرف جا رہا ہے تاکہ خدا کے میدان عدالت میں اتر جائے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب انسان "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہنچے گا۔ بیشتر لوگوں پر یہ لمحہ آچکا، بقیہ لوگوں پر یہ لمحہ بہت جلد آنے والا ہے۔

ہماری پہلی منزل گوالیار تھی۔ گوالیار مدھیہ پردیش کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں کئی صنعتیں ہیں جس نے اس شہر کو خوشحال شہر بنا دیا ہے۔ یہاں بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں۔ یہاں کے مشہور قدیم قلعہ میں چھ مندروں کے ساتھ ایک مسجد بھی موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے دور میں ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کس قدر اتحاد اور رواداری موجود تھی۔ غیر منقسم ہندستان میں ۶۰۱ ریاستیں تھیں۔ ان میں پندرہ ریاستیں بڑی ریاستیں تھیں۔ ان بڑی ریاستوں میں سے ایک گوالیار بھی تھی۔

آزادی کے بعد جو کانسٹی ٹیوشن (دستور) بنا، اس میں ہندستانی ریاستوں کی دو تقسیم کی گئی تھی۔ ایک وہ جو ۱۹۴۷ سے پہلے براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت تھیں۔ دوسری وہ جہاں راجہ یا نواب حکومت کر رہے تھے۔ ابتدائی دستور (۱۹۵۰) میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اول الذکر ریاستوں میں انتظامی سربراہ (Executive head) کی حیثیت سے گورنر مقرر کئے جائیں گے، اور ثانی الذکر ریاستوں میں سابق راجہ یا نواب ہی کو انتظامی سربراہ کی حیثیت حاصل رہے گی جن کو راج پرمکھ کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان سابق راجاؤں کے لئے اور بھی کئی امتیازی حق تسلیم کیے گیے تھے۔ مثلاً صرف خاص (Privy perses) وغیرہ۔

مگر اس کے بعد کانسٹی ٹیوشن کی ۲۶ ویں ترمیم (۱۹۷۱) مرکزی اسمبلی نے منظور کی جس کے مطابق سابق راجاؤں اور نوابوں کو دی ہوئی تمام رعایتیں یک لخت ختم کر دی گئیں۔ یہ ایک نہایت عبرتناک مثال ہے۔ ہندستان کے تمام مسلم لیڈر پچھلی نصف صدی سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے قانونی تحفظات حاصل کریں۔ انھوں نے اس واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا کہ جب خود دستور میں دئے

ہوئے کاغذی حقوق تنکے کی مانند ہوا میں اڑ گئے تو دوسرے کاغذی حقوق کی کیا حیثیت۔ ایسے کاغذی تحفظات کا ملنا بھی اتنا ہی بے قیمت ہے جتنا ان کا نہ ملنا۔ اس دنیا میں قومیں اپنے ذاتی استحقاق کے بل پر جیتی ہیں نہ کہ قانونی تحفظات کے بل پر۔

جہاز کے اندر انڈین ایرلائنز کا ماہنامہ سواگت (نومبر ۱۹۸۸) پڑھنے کے لئے موجود تھا۔ اس کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ ہوائی جہاز (ایربس) زمین کی سطح سے ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا ایک منٹ میں ۱۰ میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ ایک عام ایربس میں ۳۷۳ مسافروں کے لئے سیٹ ہوتی ہے۔ جہاز میں اگرچہ کچھ لوگ سگرٹ پیتے ہیں۔ مگر اس کے اندر کی ہوا خراب نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخصوص انجینیرنگ کے ذریعہ کیبن کی ہوا ہر ۹۰ سکنڈ میں مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔

ہوائی جہاز کے سفر کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۲۷ میں ہوا۔ سب سے پہلے امریکہ کے فورڈ اور بوئنگ نے تجارتی سطح پر جہاز بنایا۔ ابتدائی جہازوں میں انفصال (Insulation) کا انتظام نہ ہونے کی بنا پر کیبن کے اندر بہت زیادہ شور رہتا تھا۔ مسافر وقتی طور پر بہرے ہو جاتے تھے۔ تمام گفتگو اشاراتی زبان (Sign language) کے ذریعہ ہوتی تھی۔ ابتدائی جہاز ایک گھنٹہ میں صرف ۱۱۵ میل کا فاصلہ طے کرتے تھے۔ خبر ہے کہ جاپان اپنے یہاں ہوائی جہاز کی صنعت شروع کر رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو عجب نہیں کہ آئندہ ہوائی جہاز کی صنعت ایک نئے ترقی یافتہ مرحلہ میں داخل ہو جائے۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۸ کی دوپہر کو میں بھوپال پہنچا تو بھوپال مجھے ایک جانا پہچانا شہر نظر آیا۔ بار بار کے سفر کے بعد اب بھوپال میرے لئے کوئی اجنبی جگہ نہیں رہی۔ مجھے تقریباً ۲۵ سال پہلے کی بات یاد آئی۔ میں ایک سفر پر تھا۔ رات کے وقت ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ باہر دیکھا تو بورڈ پر "بھوپال" لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تک میں نے بھوپال کو نہیں دیکھا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ بھوپال کیسا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین آگے بڑھ گئی اور اسٹیشن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پڑھ کر یا سن کر میں نے "بھوپال" کا لفظ جان لیا تھا، مگر ابھی میں نے بھوپال کے شہر کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اُس وقت میں بھوپال کی کوئی تصویر اپنے ذہن میں نہ بنا سکا۔ یہ واقعہ انسانی علم کی نوعیت کو بتاتا ہے۔ آدمی کے پاس اگر "لفظ" ہو مگر اس کے پاس "معلومات" کا سرمایہ نہ ہو تو وہ کبھی حقیقت کو جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بھوپال میں میرا قیام جناب ذاکر صاحب کی رہائش گاہ پر تھا جو ایک مقامی تاجر ہیں۔ وہ خاموش کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اصول دو لفظ میں یہ ہے ـــــ کم بولنا زیادہ کرنا۔

موجودہ زمانہ میں کھلے چڑیا گھر بنائے جاتے ہیں جن کو اوپن زو (Open zoo) کہا جاتا ہے۔ بھوپال میں اسی قسم کا ایک اوپن زو ہے اور اس کا سرکاری نام ون وہار ہے۔ آجکل ون وہار کے ڈائرکٹر سید مسعود الحسن صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ ون وہار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ ون وہار گیارہ سو ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ اس میں سفید شیر اور دوسرے قسم کے شیر ہیں اور بہت سے دوسرے جانور ہیں جو قدرتی ماحول میں رہتے ہیں۔ کئی شیر اور دوسرے جانور دیکھے۔ اس دوران ہمارے ایک ساتھی نے سید مسعود الحسن صاحب سے کہا کہ اس کھلے چڑیا گھر کے مینجمنٹ میں آپ لوگوں کو کسی قسم کی زحمت تو پیش نہیں آتی۔ انھوں نے کہا کہ جانوروں کو مینج کرنا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں، البتہ انسانوں کو مینج کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ اس زو کو دیکھنے کے لئے سالانہ تقریباً چار لاکھ آدمی آتے ہیں۔ ان انسانوں کا حال یہ ہے کہ جانور چپ چاپ بیٹھا ہو تب بھی وہ اس کو پتھر مارتے ہیں۔ جانور کی زندگی کے لئے انسان (Wild life) کا لفظ بولتا ہے، لیکن اگر ان جانوروں سے پوچھئے، تو وہ کہیں گے کہ جو نام تم ہم کو دے رہے ہو، وہ تمہیں خود اپنے آپ کو دینا چاہئے۔

مدھیہ پردیش کے موجودہ چیف منسٹر ارجن سنگھ بھی ایک جلسہ میں موجود تھے۔ یہاں کے مسلمانوں نے عام طور پر ان کی تعریف کی۔ ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بھوپال یونیورسٹی کا نام بدل کر برکت اللہ یونیورسٹی کر دیا ہے۔

مولانا برکت اللہ ولد شجاعت اللہ صاحب ۷ جولائی ۱۸۵۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۷ ستمبر ۱۹۲۷ کو سان فرانسسکو میں انتقال کیا۔ یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو کابل میں جلاوطن حکومت بنائی گئی۔ راجہ مہندر پرتاپ اس کے صدر تھے اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کو اس کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا برکت اللہ صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا تھا جس کا نام اسلامک فریٹرنٹی تھا۔ وہ بھوپال کے ممتاز "فریڈم فائٹر" تھے۔

یہاں کے ہندی روزنامہ افکار (۳ ستمبر ۱۹۸۸) نے برکت اللہ بھوپالی کے سلسلہ میں راجہ مہندر پرتاپ کا ایک خط ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۸ شائع کیا ہے۔ اس میں راجہ مہندر پرتاپ لکھتے ہیں: مولانا برکت اللہ نے نہایت محبت وصداقت سے اپنے فرائض ادا کئے۔ چونکہ وہ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور حضرت عالی سردار نصر اللہ خاں صاحب صدر اعظم افغانستان کو پہلے انگلینڈ میں مل چکے تھے، ہم کو افغان حکومت سے رفاقت پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ بعد کو مولانا صاحب لال روس کے بھی دوست بنے اور ہندستان کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکے۔

"افکار" صحافت کی دنیا میں ایک نیا تجربہ ہے۔ یہ ایک ایسا اخبار ہے جس کی زبان اردو ہوتی ہے۔ مگر اس کا رسم الخط دیوناگری ہوتا ہے۔ مثلاً افکار (۱۲ نومبر) نے میرا انٹرویو چھاپا۔ اس کی سرخی کے الفاظ حسب ذیل تھے جو ہندی رسم الخط میں لکھے ہوئے تھے:

مکمل اعراض ہی تمام مسائل کا حل

اس کے قارئین میں تقریباً ۳۰ فی صد ہندو ہیں۔ میں نے افکار کے اڈیٹر صاحب سے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے ایسے ہندو ہیں جو اردو زبان کو پسند کرتے ہیں مگر فارسی رسم خط نہ جاننے کی وجہ سے اردو کو پڑھ نہیں سکتے۔ افکار ان کی اس مشکل کو حل کر دیتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ افکار میں ہندو کو دوسرا نقطۂ نظر بھی پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ اس طرح اس کا شک دور ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری ریاستوں میں بھی اس قسم کے اخبار جاری کرنا چاہئے۔ اس سے قومی ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

۱۱ نومبر کی شام کو روزنامہ افکار (ہندی) نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کے بارہ میں میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کچھ لوگوں کو اس لئے مشکل پیش آتی ہے کہ دوسرے لوگ مسلم اور غیر مسلم کے تعلق کو حریف اور رقیب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس میں یہ کہتا ہوں کہ دونوں کے درمیان جو تعلق ہے، وہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ اگر آپ حریفانہ نفسیات سے اٹھ کر داعیانہ نفسیات کے ساتھ دیکھ سکیں تو آپ ہمارے نقطہ نظر سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں گے۔

۱۱ نومبر کی شام کو سیرت کے جلسہ میں خطاب تھا۔ اس کو جناب خلیل اللہ خاں ایڈوکیٹ اور ان

کے ساتھیوں نے منظم کیا تھا۔ اس میں میں نے ایک حدیث کی تشریح کی جس کے الفاظ یہ ہیں: انّ الفتنة نائمة لعن اللہ من ایقظها (فتنہ سویا ہوا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "فتنہ" خود نظام تخلیق کے تحت اس دنیا میں موجود ہے، اور وہ لازماً موجود رہے گا۔ ہمارے کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ فتنہ کی موجودگی پر شور وغوغا کریں، بلکہ اصل کام یہ ہے کہ سوئے ہوئے فتنہ کو سویا ہوا رہنے دیں، ایسا نہ کریں کہ اپنی نادانی کے ذریعہ اس کو جگا دیں۔

۱۲ نومبر کی دوپہر کو تعلیمی سمینار میں شرکت کی۔ اس سمینار کے مہمان خصوصی جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تھے۔ سید حامد صاحب نے اپنے علم اور تجربہ کی روشنی میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو خود اپنی محنت سے تعلیم میں آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر وہ دوسروں کی طرف دیکھتے رہے تو ان کی تعلیمی پسماندگی میں مزید اضافہ کے سوا کچھ اور ہونے والا نہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تعلیم بذات خود مطلوب ہے۔ حتی کہ اگر "مسلم اسکول" موجود نہ ہوں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ "غیر مسلم اسکول" میں داخلہ لیں۔ قوم کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو، اور یہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کا اصل مسئلہ اغیار کی مفروضہ سازش نہیں ہے۔ بلکہ سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کا تعلیمی پچھڑا پن ہے۔ اس کی وجہ سے مسلم رہنماؤں اور مسلم عوام کے درمیان ایک ذہنی بعد (Intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو امتیازی لیاقت کے راستہ پر آگے بڑھائے۔ مگر مسلم طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں رعایتی داخلے اور رعایتی سروسیں دی جائیں۔ اس بنا پر دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اور کوئی حقیقی تعمیری کام انجام نہیں پاتا۔ جناب سلیم شمسی صاحب اس سمینار کے داعی تھے۔

۱۳ نومبر کو منشی حسین خاں ٹکنیکل اسکول کے جلسہ میں شرکت کی۔ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر مسٹر ارجن سنگھ اس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر میری ایک تقریر ہوئی۔ اس میں میں نے کہا کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں ٹکنالوجی میں پیچھے ہو گئے۔ حالانکہ یہ عین اسلام کا تقاضا تھا کہ وہ اس میدان میں آگے رہتے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ بقدر استطاعت طاقت فراہم کرو (واعدوا لهم

ما استطعتم من قوۃ) قدیم ذہن کے تحت مسلمان یہ سمجھتے رہے کہ اس کا مطلب فوج اور تلوار کی طاقت جمع کرنا ہے۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے وہ ہتھیاروں کے ذہن سے سوچتے رہے۔ مگر ساری دنیا میں انھیں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی اصل طاقت علم ہے، اور علم میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی خصوصی طور پر طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا گیا۔

۱۳ نومبر کی دوپہر کو قدسیہ مسجد میں قارئین الرسالہ کا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے دعوت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس اجتماع میں کچھ ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ وہ الرسالہ ہر ماہ پڑھتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھائی مسٹر راج تیواری نے تقریر کے بعد اپنا تاثر بتلاتے ہوئے کہا: دعوت کے بنا اسلام ایک فیوز بلب کی طرح ہے۔ بلب کا فیوز اڑ جائے تو ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں دعوت نہ رہے تو گویا کچھ بھی نہ رہا۔ مسٹر پی این گپتا ایڈوکیٹ نے بھی اسی قسم کی بات کہی۔

۱۳ نومبر کو جناب محمد خان صاحب (سابق ڈسٹرکٹ جج) کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں بھوپال کے وکلاء اور جج صاحبان شریک تھے۔ اس موقع پر میں نے اسلامی عبادت کی حقیقت بیان کی۔ اس سلسلہ میں نماز کے تین اعمال ـــــــ اللہ اکبر، الحمد للہ اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی وضاحت کی گئی۔ بھوپال میں جتنے خطابات ہوئے، ان کا ٹیپ مقامی لوگوں کے پاس موجود ہے۔

بھوپال میں پروگرام

۱۱ نومبر ۱۹۸۸	انٹرویو روزنامہ افکار (ہندی)	مسلمانوں کے موجودہ مسائل
	کارکنان الرسالہ سے ملاقاتیں	
۱۲ نومبر ۱۹۸۸	سیمینار بمقام ٹیگور ہال میں تقریر	ملت اسلامیہ کے تعلیمی مسائل
	جلسہ سیرت مقام برکت اللہ میدان میں خطاب	سیرت محمدی کا پیغام امن
۱۳ نومبر ۱۹۸۸	محمد خاں صاحب سابق ڈسٹرکٹ جج کی رہائش گاہ پر وکلاء اور جج صاحبان سے گفتگو	
	منشی حسین خاں ٹکنیکل اسکول کے اجلاس میں شرکت	سائنسی تعلیم کی اہمیت
	قدسیہ مسجد میں قارئین الرسالہ کا اجتماع	دعوت کی اہمیت

اس سفر میں ایک نئی بات یہ سامنے آئی کہ پچھلے ایک سال کے عرصہ میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی اور ان کے ساتھیوں نے ہندو مسلم تعلقات کو خوش گوار بنانے کا کام وسیع پیمانہ پر کیا ہے۔ اس کے بعد دونوں فرقے ایک دوسرے سے قریب آئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف روک قائم ہوا ہے بلکہ دعوت کے کام کے لئے بھی نئے امکانات کھلے ہیں۔ اس انداز کی کوششیں ملک کے ہر شہر اور ہر علاقہ میں کی جانی چاہئیں۔ مسٹر پریم نرائن گپتا ایڈوکیٹ بھوپال کی انسانی برادری کے صدر ہیں۔

ایک مشترک نشست میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارا ملک دو مرحلوں سے گزر چکا ہے اور اب اسے تیسرے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔

پہلا مرحلہ ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہے۔ اس وقت ہندستان پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے لیڈروں نے کہا کہ ہماری تمام مصیبتوں کی جڑ بدیشی حکومت ہے۔ اگر بدیشی راج ختم ہو جائے اور ملک والوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی، ہر آنکھ کے آنسو پچھ جائیں گے۔ ۱۹۴۷ میں یہ نشانہ پورا ہو گیا۔ مگر آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارا کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے جو آزادی کے بعد شروع ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں، قانون کے ذریعہ اصلاح، کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک بے شمار قانون ہر چیز کے بارہ میں بنائے گئے۔ مگر قانون کی بھرمار کے باوجود ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہ ہوا۔ بلکہ "غلام ہندستان" میں جتنے مسئلے تھے، اب "آزاد ہندستان" میں اس سے زیادہ مسئلے پائے جاتے ہیں۔

اب آخری بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم مذہب کا تجربہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب ہی واحد چیز ہے جو زندگی کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ مذہب کا مطلب لاؤڈ اسپیکروں کا شور اور جلوسوں کے مظاہرے نہیں ہیں۔ مذہب کی اصل حقیقت جوابدہی (Accountability) ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو اپنے تمام کاموں کا خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ لوگوں میں اس احساس کو جگایا جائے۔

ایک نشست ہوئی جس میں کچھ مسلمان تھے اور زیادہ تر ہندو بھائی شریک تھے۔ میں نے کہا کہ برصغیر (ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش) کا اگر آپ سفر کریں تو آپ پائیں گے کہ ہر آدمی بس ایک ہی سوچ میں گرفتار ہے، اور وہ ہندو مسلم سوچ ہے۔ اس علاقہ میں تقریباً ۱۰۰ ملین انسان آباد ہیں۔

مگر ہر ایک بس ایک ہی اصطلاح میں سوچنا جانتا ہے۔ اور وہ ہندو مسلم کی اصطلاح ہے۔

میں نے کہا کہ یہ جھوٹی سوچ ہے۔ اصل سوچ یہ ہے خدا اور انسان کے اعتبار سے سوچا جائے۔ زندگی اور موت، دنیا اور آخرت کی اصطلاحوں میں معاملہ کو سمجھا جائے۔ یہاں ہندو اور مسلمان دونوں قومی جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں مگر یہ سب کے سب مصنوعی جھگڑے ہیں۔ اصل چیز جو سامنے آنے والی ہے وہ یہ کہ انسان کو مرنا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنے رب کے سامنے حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

میں نے کہا کہ اگر ایک بلڈنگ میں آگ لگ جائے تو ہر طرف شعلے بھڑکنے لگیں گے، اس وقت کوئی شخص ہندو مسلم اصطلاحوں میں نہیں سوچے گا۔ اس وقت ہر آدمی زندگی اور موت کے ذہن سے سوچے گا۔ ضرورت ہے کہ آگ لگنے سے پہلے یہی سوچ پیدا ہو جائے۔

حضرت پیر سعید میاں صاحب مجددی بھوپال کے مشہور بزرگ ہیں۔ ان کی ہر بات نصیحت اور وعظ سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران کامیاب زندگی کا گُر دو لفظوں میں اس طرح بیان فرمایا ——— ذوق کی بلندی، زندگی کی سادگی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے لکھا ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں میں کوئی صحیح رہنما پیدا نہیں ہوا۔ اس درمیان میں جو لوگ اٹھے وہ حالات کے ردعمل کی پیداوار تھے نہ کہ مثبت فکر کی پیداوار۔ میں نے کہا کہ میں نے تو صرف ڈیڑھ سو سال کی بات کہی ہے مگر آپ کے محبوب شاعر اقبال تو اس مدت کو اس سے بھی زیادہ وسیع کر رہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند۔

میں نے کہا کہ اگر آپ میری بات پر تنقید کرتے ہیں تو اقبال کی بات پر دگنا طاقت کے ساتھ تنقید کیجیے۔ اس کو سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

شری برج کشور سانگھی ایڈوکیٹ سے دوبار ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی ہیں۔ وہ اگرچہ ہندو مذہب میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر اتنی ہی قوت کے ساتھ وہ مذہبی رواداری کے بھی حامی ہیں اور ہندو مسلم تعلقات کو خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلم لیڈر وزیروں اور حکمرانوں کی طرف دوڑ رہے ہیں، انھیں اس قسم کے سنجیدہ ہندوؤں سے ربط بڑھانا چاہئے۔ یہ

بلاشبہ ملکی حالات کو درست کرنے کے لئے اول الذکر دوڑ دھوپ سے زیادہ کارآمد ہے۔

قاضی وجدی الحسینی صاحب نے بتایا کہ ایک بار ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی ہے۔ یہ ملاقات لاہور میں موصوف کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے ہوئی۔ اس وقت علامہ اقبال مرض الموت میں مبتلا تھے۔ میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ علامہ اقبال کی کوئی ایسی بات بتائیے جو آپ نے خود براہ راست سنی ہو۔

قاضی صاحب نے کہا کہ مذکورہ ملاقات میں موت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک لطیفہ بتایا تھا جو اب تک مجھے یاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیخ سعدی نے ایک کہانی لکھی ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں ایک پہلوان رہتا تھا۔ پہلوان کی عمر زیادہ ہونے لگی تو بادشاہ نے اس سے کہا کہ کسی جوان آدمی کو اپنے کرتب سکھا کر پہلوان بنا دو تاکہ تمہارے بعد دربار کی یہ جگہ خالی نہ رہے۔ پہلوان نے ایک نوجوان کو منتخب کرکے اس کو سکھانا شروع کیا یہاں تک کہ وہ ایک تربیت یافتہ پہلوان بن گیا۔

اس کے بعد وہ شخص اپنے استاد سے باغی ہوگیا۔ وہ شہر میں لوگوں کے درمیان اس طرح کی باتیں کرنے لگا گویا کہ وہ اپنے استاد سے زیادہ بڑا پہلوان ہے۔ یہ بات بادشاہ کو اچھی نہیں لگی۔ درباریوں سے گفتگو کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ استاد اور شاگرد دونوں کا مقابلہ کرایا جائے۔

دونوں اکھاڑے کے اندر جمع ہوئے۔ شاگرد نے کچھ دیر تک زور آزمائی کی اس کے بعد اچانک استاد نے اس کو زمین پر پٹک دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے استاد سے پوچھا کہ تم تو اپنا سارا کرتب اپنے شاگرد کو سکھا چکے تھے۔ پھر تم کس طرح اس کو ہرانے میں کامیاب ہوئے۔ استاد نے جواب دیا: پہلوان ہمیشہ ایک داؤ اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس کہانی کو بیان کرنے کے بعد کہا ——— اسی طرح پہلوانِ فطرت نے ایک داؤ اپنے پاس محفوظ رکھا ہے، اس کا نام موت ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب (عمر ۴۵ سال) بھوپال زو کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ برسوں تک جنگلوں میں رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جنگل میں کئی بار ایسا ہوا کہ چلتے ہوئے شیر سامنے آگیا۔ مگر شیر (دفاع کے سوا) کبھی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ چنانچہ مجھ کو دیکھتے ہی شیر اپنے آپ راستہ بدل کر دوسری طرف چلا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ شیر جب آدمی کو دیکھتا ہے تو فوراً واپس ہوکر تیزی سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ شیر انسان سے ڈرتا ہے۔ وہ "چوپایہ" پر حملہ کرتا ہے۔ مگر "دوپایہ" سے خود ڈرتا ہے۔ شیر انسان خور صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ انسان خود کوئی حماقت کرکے شیر کو یہ حقیقت بتا دے کہ وہ شیر سے کمزور ہے۔

یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی طاقت کا ضرورت سے زیادہ اندازہ کر لیتا ہے۔ اس لئے ایک شخص دوسرے شخص سے خائف رہتا ہے۔ خوف کی یہ نفسیات جارحیت کے خلاف ایک مستقل چیک ہے۔ مگر جب کوئی آدمی غلط اور ادھورا اقدام کرکے اپنی کمزوری سے فریق ثانی کو باخبر کر دے۔ تو ایسے آدمی کا حال اپنے سماج میں وہی ہو جاتا ہے جو مردم خور شیر کے پڑوس میں انسان کا۔

سید مسعود الحسن صاحب جو وائلڈ لائف کے عالم ہیں، انھوں نے بتایا کہ شیر، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح ایک علاقہ پسند (Territorial) جانور ہے۔ شیر ہمیشہ ایک علاقہ کو اپنا علاقہ بنا لیتا ہے۔ اس کے نشان کے طور پر وہ ایسا کرتا ہے کہ وہ اپنے علاقہ کی "سرحدوں" پر گھوم کر پیشاب کے راستہ سے ایک خاص طرح کا کیمیکل چھڑک دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے جس کو دوسرے شیر پہچان لیتے ہیں۔ چنانچہ دوسرا کوئی شیر جب وہاں آتا ہے تو وہ اس بو کو سونگھ کر جان لیتا ہے کہ یہ ایک اور شیر کا علاقہ ہے، وہ فوراً وہاں سے واپس چلا جاتا ہے۔

شیر علاقائی تقسیم کے ذریعہ اس سے بچتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ انسان کے لئے قدرت کا بتایا ہوا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنی حد پر رہے۔ نہ ایک شخص اپنی حد سے باہر نکلے اور نہ دوسرا شخص اس کی حد کے اندر داخل ہو۔

سید مسعود الحسن صاحب نے بتایا کہ اس سے پہلے وہ شہڈول نیشنل پارک میں تھے۔ وہاں ایک جاپانی فوٹو گرافر آیا اور ایک ہوٹل میں دو مہینے تک ٹھہرا رہا۔ اس کا روزانہ کا خرچ تقریباً ۵۰۰ روپیہ تھا۔ وہ ہاتھی پر چڑھ کر پارک میں گھومتا تھا اور شیروں کے فوٹو لیتا تھا۔ اس طرح اس نے تقریباً دس ہزار فوٹو حاصل کئے اور پھر واپس چلا گیا۔

فوٹو گرافر سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک ماہانہ میگزین نکلتا ہے۔ یہ ہر مہینہ کسی خاص جانور کے فوٹو شائع کرتا ہے۔ آئندہ ہمارا میگزین شیر کے فوٹو شائع کرنے والا ہے۔

میں نے جو فوٹو لیے ہیں، ان میں سے ایک سو فوٹو چنے جائیں گے اور ان کو میگزین میں شائع کیا جائے گا۔ اس میگزین کی اشاعت ایک لاکھ ہے، اور ہر ایک شمارہ کی قیمت ڈیڑھ سو روپیہ ہوتی ہے۔

فوٹو گرافر نے واپسی کے بعد اپنے میگزین کا وہ شمارہ سید مسعود الحسن صاحب کے پاس بھیجا جس میں اس کے فوٹو شائع کئے گئے تھے۔ اس کو میں نے دیکھا۔ آرٹ پیپر پر شیروں کی نہایت عمدہ تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں شیر کی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ میگزین گویا شیر کی بابت ایک فلم ہے ـــــ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کی صحافت کا معیار کتنا بلند ہے۔

سید مسعود الحسن صاحب سے میں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر سالم علی کی سوانح حیات پڑھی ہے جس کا نام ہے :

The Fall of Sparrow

اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چڑیوں سے کتنی زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ ایک بار ڈاکٹر سالم علی ہمارے یہاں آئے۔ ہم ان کو جنگل میں لے گئے۔ وہ دوربین لگائے ہوئے چڑیوں کو دیکھا تے کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک چڑیا کو دیکھنا شروع کیا جس کو بش چاٹ (Bush chat) کہا جاتا ہے۔ اسی وقت جھاڑی میں ایک شیر دکھائی پڑا۔ میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے وہ شیر ہے۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور برابر چڑیا کو دیکھتے رہے۔ جب میں نے کئی بار کہا تو وہ بولے ـــــ اس بش چاٹ کو تو دیکھو :

Look at this bush chat

اسی کا نام ذہنی ارتکاز ہے، اور اسی ذہنی ارتکاز میں تمام بڑی بڑی ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

بہت سے ہندو بھائی رہائش گاہ پر اور اجتماعات میں آئے۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یا تو الرسالہ (انگریزی) پڑھتے ہیں یا اردو الرسالہ کسی سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ انھوں نے عام طور پر یہ بات کہی کہ الرسالہ کو ہندی زبان میں نکالا جانا چاہئے۔ ایک ہندو نوجوان نے کہا : میرے جیسے کتنے لوگ ہیں جو ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ ان کو ہندی الرسالہ سے روشنی ملے گی۔ مسٹر راج تیواری کو الرسالہ سے اتنی دلچسپی ہے کہ اس کو براہ راست پڑھنے کے لئے انھوں نے اردو سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس سے پہلے وہ انگریزی الرسالہ پڑھ رہے تھے۔

ایک نوجوان نے "آٹوگراف" کے لئے کہا۔ میں نے اپنے دستخط کے ساتھ ان کو یہ جملہ لکھ کر دے دیا:
زندگی آسانیوں کا چمنستان نہیں، زندگی مشکلوں کا خارزار ہے۔

بھوپال سے دہلی کے لئے انڈین ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۳۴ سے واپسی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر کئی لوگ آگئے تھے۔ یہاں ایک چھوٹا سا اجتماع ہوگیا۔ جس میں اسلامی دعوت سے متعلق کچھ باتیں عرض کی گئیں۔

ہوائی جہاز کی طرف بڑھا تو گیٹ پر ایک واقعہ پیش آیا۔ انڈین ایئرلائنز کے عملہ کی ایک خاتون گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا: مولوی صاحب، میری بچی کے لئے دعا کیجئے، وہ بہت بیمار ہے۔ یہ لفظ وہ بار بار دہراتی رہی۔ اس نے اپنا نام روزی بتایا۔ میرا مولویانہ حلیہ دیکھ کر اس نے سمجھا کہ یہ کوئی مذہبی آدمی ہے۔ اس بنا پر اس نے دعا کے لیے کہا۔

جدید انسان یہ کہتا ہے کہ مولوی آدمی سیاست نہیں جانتا۔ مگر عین اسی وقت اس کا یقین ہے کہ "مولوی آدمی" روحانیت جانتا ہے۔ ایسی حالت میں داعی کو اس دروازے سے داخل ہونا چاہئے جو اس کے لئے کھلا ہوا ہے، نہ کہ وہ اس دروازہ سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے جو اس کے لئے بند ہے۔

الرسالہ کیسٹ

مندرجہ ذیل کیسٹ تیار ہیں۔ خواہش مند حضرات منگوا سکتے ہیں (ہدیہ فی کیسٹ ۲۲ روپیہ)

نمبر ۱ ایمان
۲ اسلامی دعوت کے جدید امکانات
۳ اسلامی اخلاق
۴ اتحاد
۵ تعمیرِ ملت
۶ سنتِ رسولؐ
۷ میدانِ عمل

الرسالہ کا ایک نمبر زیر تیاری ہے جس کا نام "اسلام دور جدید کا خالق" ہوگا۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے بتایا جائے گا کہ موجودہ زمانہ کی تمام علمی اور تمدنی ترقیاں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلامی انقلاب کا نتیجہ ہیں۔ یہ نمبر تقریباً ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا اور اسی نسبت سے اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ آئندہ اس سلسلہ میں متعین اعلان کیا جائے گا۔

محمد شفیع صاحب رانوی (کراچی) نے اطلاع دی ہے کہ "پاکستان کے چار صوبائی دارالحکومتوں سے شائع ہونے والے ایک سرکاری روزنامہ مشرق (جو کہ کمپیوٹر ٹرمینل پر کتابت ہوتا ہے) نے گزشتہ کچھ عرصہ سے محترم مولانا وحید الدین خاں صاحب کے مضامین و مقالات کو نمایاں طور پر اور بڑے اہتمام سے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے"۔

نرنکاری مشن ایک بڑا مشن ہے جس سے لاکھوں لوگ وابستہ ہیں۔ اس کا ماہانہ پرچہ دہلی سے "سنت نرنکاری" کے نام سے کئی زبانوں میں نکلتا ہے۔ اس پرچہ میں اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ایک نئے اور وسیع حلقہ میں الرسالہ کا پیغام پہنچ رہا ہے۔

ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمز (نئی دہلی) کے نمائندہ نے ۳ مارچ ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر سلمان رشدی کے بارہ میں تھے۔ اس سلسلہ میں اسلام کے قانون اور اس کے عدالتی نظام کی وضاحت کی گئی۔

الرسالہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ہر شمارہ کو کئی کئی لوگ پڑھتے ہیں۔ مثلاً محمد اشرف شاہین صاحب (پیدائش ۱۹۵۷) کشمیر یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہر ماہ ایک الرسالہ خریدتے ہیں اور خود پڑھنے کے بعد دوسرے طلبہ کی مجلسوں میں اس کو سناتے ہیں۔ اس طرح ایک الرسالہ سے ہر ماہ کم از کم پندرہ افراد تک اس کا پیغام پہنچ رہا ہے۔ یہی الرسالہ کے بیشتر خریداروں اور قارئین کا حال ہے۔

بھارت وکاس پریشد کی طرف سے ۱۱-۱۲ فروری ۱۹۸۹ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ہوئیں۔ اس سمینار کا موضوع یہ تھا:

National unity and religious minorities

۱۲ فروری کو "کلوزنگ سشن" میں صدر اسلامی مرکز کا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت صدر اسلامی مرکز نے سیمنار میں شرکت کی۔ اس کی مختصر روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۷ دفتر میں اکثر ایسے لوگ آتے ہیں جو یہ کہہ کر کتابیں لے جاتے ہیں کہ "ملک یا ملک کے باہر کے کچھ غیر مسلم تعلیم یافتہ افراد ہمارے ربط میں آئے ہیں۔ ان کو ہم آپ کی انگریزی مطبوعات بطور تحفہ دینا چاہتے ہیں۔" اس طرح لوگ کثرت سے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کے لئے اسلامی مرکز کی مطبوعات سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

۸ دو امریکی پروفیسر، ڈاکٹر پیگی اسٹارکی اور ڈاکٹر آر کی نیشنز ۲۵ فروری ۱۹۸۹ء کو اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے اسلام کے مختلف موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی۔ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اپنے ساتھ لے گئے۔

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ۲۸ فروری ۱۹۸۹ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا "رشدی۔ خمینی اشو"۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلامی روشنی میں اظہار خیال کیا۔ یہ تقریر انڈین اکسپریس (یکم مارچ) اور جن ستا (یکم مارچ) اور دہلی کے دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ بعد کو دوسرے انگریزی پرچوں نے بھی اس کو نقل کیا۔ مثلاً سنڈے (۱۲-۱۸ مارچ ۱۹۸۹) وغیرہ۔

ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں: میں الرسالہ کا مطالعہ ۱۹۷۶ سے پابندی کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ اسلامی مرکز کی دوسری کتابیں بھی پڑھتا رہتا ہوں۔ شکر ہے کہ ان کتابوں کی بدولت مجھے ایمانی زندگی نصیب ہو رہی ہے۔ اس مطالعہ کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں ——— کھل گئے دل کے دریچے آپ کی تحریر سے (احسن غنی، سرینگر، کشمیر)

جناب عبد الرحمن کوندو صاحب سرینگر سے لکھتے ہیں: مولانا مسعودی صاحب برابر الرسالہ کا مطالعہ فرماتے ہیں۔ بعض پرچوں میں آپ کے خلاف بے بنیاد تنقید دیکھ کر مولانا مسعودی صاحب نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا وحید الدین صاحب کی تحریرات کے توڑ کے لئے ان کے مخالفین کے پاس کوئی ٹھوس اور معقول دلیل نہیں ہے،

اس لئے ان کے مخالفین بے سر و پا اور دور از کار تاویلات سے کام لے رہے ہیں۔

ایک صاحب لکھتے ہیں: چند ماہ سے الرسالہ کا پابندی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ الرسالہ کے مطالعہ سے پہلے میں ایک جوشیلا نوجوان تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میری زندگی کا مطلب کیا ہے۔ اور مجھے کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اب الحمد للہ میں ایک ہوش مند مسلمان ہوں اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ الرسالہ کے دعوتی مشن کو اپنے طور پر جاری رکھوں (فیروز خاں اورنگ آباد)

ایک صاحب لکھتے ہیں: اس رقعہ کے ہمراہ ۱۹۲۰ روپیوں کا ڈرافٹ حاضر خدمت ہے۔ ماہنامہ میں آجکل جو مضامین آرہے ہیں وہ لائق صد تحسین و آفریں ہیں جس سے ایمان میں تازگی اور روح میں ایک جولانی فراوانی اور کیفیت وجدانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ہمارے دلوں میں ہوتا ہے، وہی صفحہ کاغذ پر رقم ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ پر اور خصوصاً فساد کے موضوع پر آپ کے نظریہ کو ملحوظ رکھا جائے تو ہندو اور مسلمان کے درمیان کھڑی ہوئی خود ساختہ دیوار منہدم ہو کر نفرت، حسد اور بیگانگی کا قلع قمع ہو جائے (محمد یوسف صدیقی، پونہ)

ایک صاحب لکھتے ہیں: میری عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ ۱۹۲۰ سے میری بدنصیب آنکھیں مسلم لیڈر شپ اور مسلمانوں کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو بحیثیت تماشائی دیکھتی رہی ہیں۔ کس طرح ان کے مہرے پٹتے اور مات کھاتے رہے۔ کیونکہ مقصد اور حصول مقصد کے ذرائع غلط۔ اس لئے ناکامی و نامرادی اس کے قدرتی ثمرات ہیں۔ آپ نے موجودہ غلط روی کو روکا ہی نہیں، بلکہ الرسالہ کے ذریعہ صغیر و کبیر کے دل و دماغ کو روشنی بخشی، حتی کہ اردو اخباروں کا رنگ تحریر اور طریقے بدل گئے (فاروق احمد خاں، علی گڑھ)

ملک کی لائبریریوں میں کثرت سے الرسالہ (اردو یا انگریزی) اور اسلامی مرکز کی مطبوعات منگوائی جا رہی ہیں۔ اس طرح زیادہ وسیع حلقہ میں اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام پہنچانا ممکن ہو سکے گا۔

"دین کامل" کے نام سے ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے جو ۳۶۸ پر مشتمل ہے اور چھپ کر آگئی ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کا ایک جامع مطالعہ شامل ہے۔

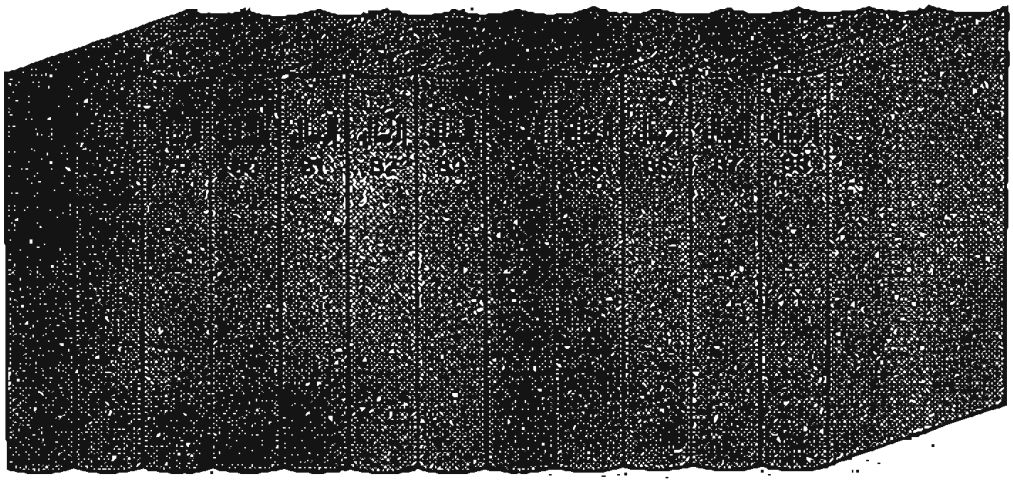

الرسالہ (مجلد)

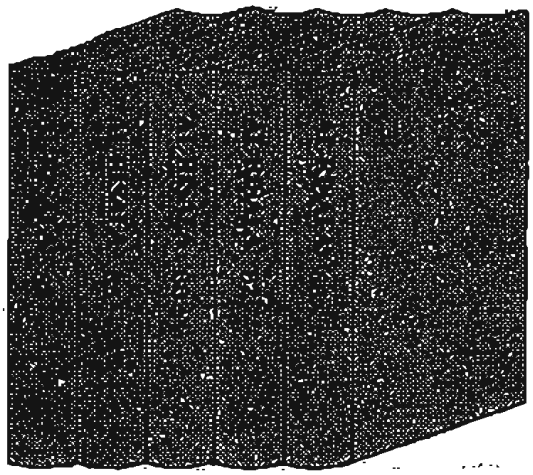

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک، ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔ ہدیہ فی جلد ۶۰ روپیہ

میوات کا سفر

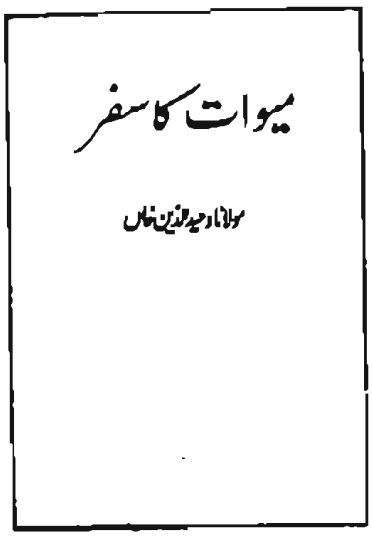

میوات کے تاریخی علاقہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر میوات کا سفر" اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایک علاقہ کا تذکرہ نہیں، وہ ۲۰ سالہ مشاہدہ کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔ براہ راست طور پر اگرچہ وہ علاقۂ میوات کی ایک تصویر ہے۔ مگر بالواسطہ طور پر وہ پوری ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ سفرنامہ کی زبان میں ملت کے حال کا جائزہ اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا نقشہ ہے۔

صفحات ۲۱۸ ہدیہ ۲۵ روپیہ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 May 1989 No. 150

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیّبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳